باب: دوم

دیپک بدکی حیات کے اہم سنگ میل

ہندوستان ایک ایسے خوبصورت گلستاں کی مانند ہے جہاں ہر جانب رنگ برنگے پھول آنکھوں کو ہمیشہ تروتازگی بخشتے ہیں اور اپنی عمدہ خشبوؤں کی بدولت اس چمن کو ہمیشہ مہکاتے رہتے ہیں۔اس ملک کے مختلف شہروں، قصبوں اور گاؤں کا بھی یہی عالم ہے کہ ہر سو اس باغ کے حسن و جمال کو بڑھاتے رہتے ہے۔انہی جگہوں میں سے ایک جگہ ہے۔وادیٔ کشمیر جس کے بارے میں فردوسی نے لکھا تھا۔[1] اگر فردوس برروے زمین است، ہمیں است وہمیں است وہمیں است۔قدرت کی بنائی ہوئی اس بےنظیر وادی کو دیکھنے کے لیے دنیا بھر سے لوگ آتے ہیں۔سفید برف کی چادر سے ڈھکے پہاڑ، شفاف جھیلیں، چنار کے درخت، پھل پھولوں سے لدے پیڑ پودے، دلکش باغیچے، چلتی پھرتی رہائشی کشتیاں اس وادی کے حسن کو دوبالا کرتی ہیں۔موتی لال ساقی اپنے مضمون ’نہرو اور کشمیر‘ میں کشمیر کے بارے میں لکھتے ہیں:

”ایک بہت ہی حسین عورت کی طرح جس کا حسن ماورائی اور انسانی خواہش سے بالا ہو کشمیر کا حسن کچھ ایسا ہی ہے۔دریا، وادی، جھیل اور پرشکوہ درخت اس حسن کا حصہ ہیں۔ اس سحر انگیز حسن کا دوسرا پہلو، جو سخت پہاڑوں، برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں، یخ کے ذخیروں اور نیچے کی طرف بھاگتے ہوئے نالوں کی صورت میں آنکھوں کے سامنے آتا ہے، کشمیر کے مردانہ جلال کا آئینہ دار ہے۔اس کے سینکڑوں چہرے اور بےشمار روپ ہیں جو بدلتے رہتے ہیں۔کبھی یہ روپ ہنستے مسکراتے نظر آتے ہیں اور کبھی روتے بسورتے۔ڈل کی سطح سے اٹھتی ہوئی دھند ایک ایسے پردے کا احساس دلاتی ہے جس کو نظریں چاک کر سکتی ہوں۔ اس دھند میں سے وہ سب کچھ نظر آتا ہے جو اس کے پیچھے چھپا ہے۔بادل نہیں پھیلا کر پہاڑی چوٹی کو گلے لگاتے ہیں یا آہستہ خرامی کے ساتھ اتنے نیچے آتے ہیں کہ لگتا ہے بچے کھیلنے میں مصروف ہیں۔ میں نے لمحہ بہ لمحہ بدلتے اس منظر کو دیکھا۔کبھی کبھی اس کی دلپذیری میں کھو کر بےخودی طاری ہو جاتی تھی۔ جب بھی میں نے اس منظر کو دیکھا مجھے خواب کا سا احساس ہوا اور ایسا لگا کہ یہ حقیقت نہیں بلکہ محض تصور ہے۔ ہماری امیدوں اور خواہشوں کی طرح جن کے ہم اپنے آپ کو تسلی دیتے ہیں مگر کبھی کبھار ہی یہ خواہشیں اور امیدیں بر آتی ہیں۔یہ خواب میں ہوئے سہارے محبوب کا روے زیبا ہے جو نیند ٹوٹنے کے ساتھ ہی ہوا ہو جاتا ہے۔“ [2]

کشمیر کے بارے میں ہمارے ادیبوں اور فنکاروں نے اپنے فن کے توسل سے اس کی خوبصورتی اور دلکشی کو ہمیشہ سراہا ہے۔ہماری ادبی دنیا کے بہت سے ایسے قلمکار ہے جنھوں نے اپنے افسانوں میں ہندوستان کے مختلف مقامات خاص طور سے کشمیر کے نظاروں کا دلکش نقش کھینچا ہے۔ایسے ہی ایک قلمکار، جن کے کارناموں کا چرچہ نہ صرف کشمیر میں ہے بلکہ پورے ملک اور دنیا کی نئی اردو بستیوں میں ہے، دیپک کمار بدکی (قلمی نام: دیپک بدکی)

ہیں۔ان کے والد صاحب کا نام آنجہانی رادھا کرشن بدکی اور ماں کا نام آنجہانی سُماوتی بدکی (میکے کا نام کملاوتی نہرو) ہے۔دیپک بدکی ۱۵فروری ۱۹۵۰ءکو اپنے آبائی مکان واقع کرالہ ٹینگ (وازہ پورہ)،مہاراج گنج،سرینگر ،کشمیر میں پیدا ہوئے۔ ان کی تاریخ ولادت کو لے کر کہیں کوئی بھی اختلاف دیکھنے کو نہیں ملتا ہے۔البتہ ان کے پہلے افسانوی مجموعے کے پہلے ایڈیشن میں ٹائپ کی غلطی کی وجہ سے یہ ۵/فروری ۱۹۵۰ لکھا گیا ہے جس کی تصحیح دوسرے ایڈیشن میں کی گئی ہے۔جن رسالوں میں بدکی کے گوشے شائع ہوئے ہیں ان میں بھی یہی تاریخ ولادت دیکھنے کو ملتی ہیں۔مثلاً اردو ادب کا نمائندہ سہ ماہی رسالہ ''انتساب'' میں بھی یہی تاریخ درج ہے۔

'' پیدائش : 15/فروری1950 / 15 Feb, 1950 , بمقام سرینگر،کشمیر ، (انڈیا)۔ '' ۲؎

دراصل دیپک بدکی نے ذاتی طور پر اپنے جنم دن کے بارے مختلف رسالوں میں بیان دیا ہے۔چونکہ بدکی کشمیری پنڈت (برہمن) ہیں اس لیے روایت کے مطابق ان کا باضابطہ ذائچہ بنایا جا چکا ہے۔لہٰذا ان کی پیدائش،یا عرفیت،یا پھر آباواجداد کے بارے میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

مشہور و معروف ادیبہ سلطانہ مہر(برمنگھم) نے اپنی کتاب ''گفتنی'، جو دنیا کے معروف عصری اردو ادیبوں کا تذکرہ ہے، میں بدکی کا بائیوڈاٹا شامل کیا ہے۔ان کے مضمون ''دیپک بدکی۔بڑودہ ، گجرات،ہندوستان'' میں بدکی کی ذیلی ذات کے بارے میں یوں انکشاف کیا گیا ہے جو ظاہر ہے کہ بدکی کے بیان پر ہی مبنی ہے:

'' دیپک بدکی کی کہانیاں مختلف جرائد میں پڑھنے کے بعد مجھے تلاش ہوئی کہ لفظ 'بدکی' دیپک کمار کے ساتھ کن معنوں میں ہے۔میں نے انہیں خط لکھا تو دیپک بدکی نے وضاحت کی ....''بات یوں ہے کہ کشمیری پنڈتوں کے سرنیم (Surname عرفیت) اسی طرح چپک جاتے ہیں جیسے انگریزوں کے ساتھ وہائٹ ، براؤن اور بروکر۔سنا ہے قدیم زمانے میں ہمارے گھر کے کسی شخص کو گھر کی زمین کی کھدائی کے وقت رائج الوقت سکوں (کشمیری زبان میں بُدکیوں) کا خزانہ مل گیا تھا جس کی وجہ سے لوگ ہمیں بدکی والے کہنے لگے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ لفظ صرف بُدکی رہ گیا۔ '' ۳؎

دراصل بدکی کی یہ خوش نصیبی تھی کہ وہ سرزمین کشمیر میں پیدا ہوئے جو تین سال پہلے ہی دیگر ریاستوں کی مانند شخصی حکومت سے آزادی حاصل کر چکی تھی۔لیکن شومئ قسمت یہ رہی کہ ریاست کے ڈوگرا مہاراجہ کے بروقت فیصلہ نہ لینے کے سبب کشمیر ایک بین الاقوامی مسئلہ بن گیا اور دونوں ملکوں،ہندوستان اور پاکستان، کے لیے ایک ناسور بن کر رہ گیا۔اس حوالے سے آج تک ہندوستان اور پاکستان کے بیچ چار جنگیں لڑی گئیں،ہزاروں فوجیوں

نے اپنی جانیں قربان کرلیں اور گزشتہ ۲۲ سال سے یہ وادی دہشت گردی سے جوجھ رہی ہے۔ درسی کتاب سماجی سائنس میں کشمیر کے مسئلے پر یوں لکھا گیا ہے۔

''کشمیر کا مسئلہ بہت ہی پیچیدہ ہوا۔ کشمیر کا راجا ہری سنگھ شش و پنج میں تھا۔ اس دوران پاکستان نے کشمیر پر حملہ کیا۔ حملہ لوٹ مار اور ظلم و ستم کے خلاف تحفظ حاصل کرنے کے لیے راجا ہری سنگھ نے بھارت سے فوجی امداد کی درخواست کی۔ بھارت نے کہا کہ پہلے بھارت سنگھ میں شامل ہونے کے دستاویز پر دستخط کرو پھر بھارت کشمیر کی حفاظت کے لیے فوج روانہ کرے گا۔ ہری سنگھ نے فوراً دستخط کئے۔ اس میں ایک دفعہ یہ بھی رکھی گئی تھی کہ مستقل اشتراک کا آخری فیصلہ حالات بحال ہونے پر عوام کی رائے کے مطابق کیا جائے گا۔ بھارتی افواج نے فوراً کشمیر پہنچ کر اس کا تحفظ کیا لیکن اس دوران پاکستان نے جموں و کشمیر کے ایک تہائی حصے پر قبضہ کرلیا تھا۔ باقی ماندہ کشمیر محفوظ رہا۔'' ؂۴

آزادی کے بعد جہاں پورے ملک میں دوبارہ فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا ہوئی وہیں اس وادی میں بھی ہندو مسلم فسادات نے سر ابھارا۔ اس قضیے کے بارے میں ڈاکٹر اعجاز علی ارشد اپنے مضمون 'نہرو اور قومی یک جہتی' میں لکھتے ہیں:

''آزادی کے بعد دو باتیں فرقہ پرستوں کی طرف سے بار بار دہرائی گئیں۔ ایک تو یہ کہ ہندوستان صرف ہندوؤں کا وطن ہے اور مسلمانوں کو اب پاکستان چلا جانا چاہیے۔ دوسرے یہ کہ مسلمان ہندوستان میں رہنا چاہیں تو انھیں اپنی تہذیب، اپنا تمدن، کلچر، یہاں تک کہ مذہب بھی بدل دینا چاہیے۔'' ؂۵

دیپک بدکی جس علاقے میں رہتے تھے وہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی اور ہندو گھر صرف ۲۲۔۲۰ کے قریب تھے۔ پیدا ہونے کے بعد ۱۹۸۹ء تک بقول بدکی انھوں نے ۱۹۶۷ء کی کشمیری پنڈت ایجی ٹیشن کو چھوڑ کر کبھی کوئی ہندو مسلم تناؤ نہیں دیکھا تھا۔ اس علاقے میں ہندو مسلم آپس میں مل جل کر رہتے تھے۔ اکٹھے اٹھنا بیٹھنا، کھیلنا، اسکول جانا، تاش کھیلنا، اور کھانا کھانا۔ اس کا کچھ کچھ ذکر ان کے افسانے 'اچانک' میں بھی ہو چکا ہے۔ اس پر طرّہ یہ کہ بدکی کے گھر کا ماحول بالکل الگ تھلگ تھا۔ پتا جی کی دست کاریوں (اخروٹ کی نقش کی گئی لکڑی اور پیپر ماشی) کی دو دوکانیں 'سودیش آرٹس اینڈ کرافٹس' کے نام سے بنڈ اور نمائش گراونڈ میں تھیں جو ۱۹۶۰ء کے آس پاس اس لیے بک گئیں کیونکہ دیپک بدکی نے دوکان پر بیٹھنے میں رضامندی نہیں دکھائی۔ انہیں دنوں ماں بھی اچانک سورگباش ہوگئیں اور پھر مصیبتوں کا ایک کارواں اس گھر پر گزر گیا۔ گھر میں دیپک بدکی کے علاوہ ان کی تین بہنیں ہیں جن میں سب سے بڑی بہن مسز گیان حالی ہے۔ اس کے بعد خود دیپک بدکی ہیں اور پھر ان کی دو چھوٹی بہنیں

ہیں جن میں سے ایک مسز ریتا دھر اور آخر میں سب سے چھوٹی بہن رینو ہے۔ بدکی ابھی کم سن ہی تھے اور آٹھویں کے بورڈ امتحانات کی تیاری کر رہے تھے کہ مارچ ۱۹۶۲ء میں والدہ کے انتقال نے ان کو زندگی کے ایک نئے رخ سے روشناس کرایا۔اس وقت ان کی عمر صرف ۱۲ سال کی تھی ۔ ماں کی جدائی کے بعد بدکی پر کئی مصیبتیں آئیں اور وہ ہمیشہ ذہنی تناؤ اور عدم استحکام کی کیفیت سے گزرتے رہے۔اس کے علاوہ گھر کے حالات بھی درہم برہم ہو چکے تھے جس کے سبب گھر کے ماحول میں اس وقت اکثر و بیشتر حد سے زیادہ تناؤ رہنے لگا تھا۔اس بات کی وضاحت دیپک بدکی اس طرح کرتے ہیں:

'' ماں کے مرنے کے بعد گھر میں کافی تناؤ رہتا تھا۔ بھائی بہنوں کے مزاج مختلف تھے۔ اوپر سے پتا جی پر بہت ساری مصیبتیں نازل ہوئیں۔ ہماری دو ہینڈی کرافٹس کی دوکانیں تھیں۔ وہ بک گئیں، پتا جی دوسو روپے ماہوار نوکری کرتے اور چار بچوں کو پالتے۔کبھی کسی کی فرمائش کو درگزر نہ کرتے ۔اس لیے ہمیشہ پریشان رہتے۔ پھر ایک سال میں تین بار انہیں زبردست چوٹیں آئیں ۔کیسے صحت یاب ہوئے بس معجزہ سا معلوم ہوتا ہے۔ '' ۶ے

ظاہر ہے کہ بدکی نے اپنی کم عمری میں ہی بہت سی مشکلوں اور الجھنوں کو جھیلا ہے۔ان کی والدہ کے وصال کے بعد ان کے والد صاحب نے سبھی بچوں کی پرورش کی ۔البتہ ان کی بوا (پھوپھی)، جن کی بچپن ہی میں شادی ہو چکی تھی اور وہ بہت جلد بیوہ ہوگئی تھیں، بچوں کی دیکھ ریکھ کرنے لگی تھی ۔وہ اپنی بوا کو پیار سے 'جگری' کہہ کر بلایا کرتے ، حالانکہ ان کا نام پرانا شوری عرف مندو دھری چودھری تھا۔ دیپک بدکی کی زندگی پر سب سے زیادہ اثر بوا کا رہا ہے کیونکہ وہ دانا بھی تھی اور قناعت پسند بھی ۔ والدہ کے گزر جانے کے بعد ان کو اسی بوا نے سہارا دیا بلکہ یوں کہیے کہ ان کی بوا نے ان کی ماں کی کمی کو پورا کیا۔انھوں نے اپنی بوا سے بہت کچھ سیکھا۔شاید اسی لیے انھوں نے اپنی تنقیدی کتاب 'عصری تحریریں' اپنی پھوپھی کے نام منسوب کی ہے۔انتساب کی زبان ملاحظہ فرمائیں:

'' حلم و دانش کی مورت اپنی بوا، پرانا شوری چودھری عرف جگری کے نام جس نے مجھے کبھی ماں کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔ '' ےے

یہاں اس بات کی طرف ضمناً اشارہ کرنا بے جا نہ ہوگا کہ آج تک دیپک بدکی کی چھ اردو اور دو ہندی کتابیں چھپی ہیں اور ان میں سے ایک کتاب کا بھی انتساب کسی بڑے رسوخ والے ادیب یا سیاست دان کے نام نہیں لکھا گیا ہے۔دیپک بدکی نے تہذیبی و اخلاقی درس اپنے گھر ہی سے حاصل کیا ۔تاہم فارمل تعلیم پانے کے لیے انھوں نے گھر کے نزدیک ہی ایک اسکول میں داخلہ لیا جس کو گانی آٹ منز جبری اسکول کے نام سے جانا جاتا تھا۔ جیسا کہ اس اسکول کے نام ہی سے ظاہر ہوتا ہے اس اسکول میں بچوں کو جبراً لا کر تعلیم دی جاتی تھی اور یہ بات

درست بھی ہے کیونکہ بدکی نے اپنے مضمون ''حیات کے اہم سنگ میل'' میں جبری اسکول کے بارے میں وضاحت کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ:

'' ان اسکولوں کو جبری اسکول اس لیے کہا جاتا تھا کیونکہ مہاراجہ ہری سنگھ (ڈاکٹر کرن سنگھ کے پتا جی) نے کشمیری مسلمانوں میں ناخواندگی دور کرنے کے لئے ان کے بچوں کو جبراً اسکول میں داخل کروانے اور انہیں اسکول لے جانے کا انتظام کروایا۔ فیس نہ ہونے کے برابر تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ اسکول میں ماسٹر جی تانبے کے چھدرے ہوئے دو پیسے فیس کے طور پر وصول کرتے اور اسکے بدلے میں مہینے میں ایک دو بار ریڈ کراس کا سوکھا دودھ **(Dried Milk Powder)** جس کی قیمت اس زمانے میں دو چار آنے ہوتی، مہیا کرتے مطلب یہ کہ تعلیم مفت تھی اور دیکھا جائے تو ریاست جموں وکشمیر میں آزادی کے بعد بھی یونیورسٹی لیول تک مفت تعلیم فراہم کی جاتی تھی۔ '' ۸؎

اس پرائمری اسکول کے سارے درسی مضامین اردو ہی میں تھے جس کے سبب بدکی کو اردو زبان کی بنیادی تعلیم کے بارے میں سب سے پہلے معلومات یہیں پر فراہم ہوئی۔ یعنی وہ حروف تہجی سے اسی اسکول میں متعارف ہوا۔ اس اسکول میں انھوں نے پانچویں جماعت تک کی درسی تعلیم حاصل کی۔ آگے کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے انھوں نے گورنمنٹ ہائر سیکنڈری اسکول نواکدل میں داخلہ لیا جو جہلم کے کنارے واقع تھا اور گھر سے تھوڑی دوری پر تھا۔ یہاں کا کیمپس بہت ہی خوبصورت تھا البتہ تعلیم کا معیار عام گورنمنٹ اسکولوں کی طرح ہی تھا۔ بدکی نے اس اسکول میں چھٹی جماعت سے لے کر آٹھویں جماعت تک کی تعلیم حاصل کی۔ اکثر مضامین انگریزی کے ذریعے پڑھائے جاتے تھے جبکہ ہسٹری جیوگرافی کے لیے اردو استعمال ہوتی تھی اور اختیاری مضمون ہندی تھا۔ چنانچہ اس طرح ان کا اردو سے رشتہ کافی حد تک ٹوٹ گیا اور اب انہیں ہندی سیکھنا پڑی۔ تاہم انھوں نے اب تک تین زبانوں کے بارے میں تھوڑا بہت علم حاصل کرلیا تھا۔ ان کے پتا جی کی بڑی تمنا تھی کہ ان کا بیٹا اچھے اسکول میں پڑھے اس لیے نویں جماعت میں بدکی کا داخلہ ایک آریہ سماجی پرائیوٹ اسکول' ڈی۔اے۔وی۔ ہائر سیکنڈری اسکول امیرا کدل، سرینگر **(DAV Higher Secondary School Amira Kadal, Srinagar)** میں کرایا گیا۔ یہ اسکول بھی انگلش میڈیم ہی تھا مگر اختیاری مضمون ہندی تھا۔ اردو کے ساتھ پوری طرح سے ناتا ٹوٹ گیا۔ البتہ یہاں ہندی کا اسٹنڈرڈ بہت ہی اونچا تھا جس کے لیے بدکی کو کافی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ سائنس اسٹریم اور وہ بھی حیاتیاتی گروپ ہونے کی وجہ سے اب زبانوں کے سیکھنے سکھانے کا کام بند ہوگیا اور یہ صورت حال پوسٹ گریجویشن تک یونہی چلتی رہی۔ ہائر سیکنڈری یعنی گیارہویں جماعت پاس کرکے بدکی نے سری پرتاپ کالج، سرینگر میں داخلہ لیا جہاں سے انھوں نے بی ایس سی (آنرس) [بوٹنی] کا امتحان پاس کرلیا۔ کالج کے دوران ان کو

سارے مضامین انگریزی میں پڑھنے پڑے۔ مثلاً انگریزی، بائیولوجی، کیمسٹری، اور فزکس وغیرہ۔ یونیورسٹی میں بس ایک ہی مضمون 'بوٹنی' کی مختلف شاخیں تھیں جن کی تعلیم ضروری تھی اور جو انگریزی میں ہی حاصل کی جاسکتی تھی۔ فیاض احمد وجیہہ کو دیے گئے ایک انٹرویو میں، جو انتساب کے خصوصی گوشے میں چھپا تھا، دیپک بدکی کی تعلیم کے بارے میں فیاض احمد وجیہہ یوں انکشاف کرتے ہیں:

'' مادری زبان کشمیری کے علاوہ انگریزی، اردو اور ہندی زبان پر بھی ان کو دسترس حاصل ہے۔ '' ۹

حالانکہ دیپک بدکی سائنس کے طالب علم ہونے کے سبب میڈیکل کالج میں داخلہ لینے کے خواہاں تھے مگر انہیں اس میدان میں ناکامی حاصل ہوئی۔ اس لیے انھوں نے اپنی پڑھائی جاری رکھی۔ انھوں نے کشمیر یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ اس طرح بدکی نے ۱۹۶۸ء سے ۱۹۷۰ء تک ایم ایس سی (باٹنی){M Sc Botany} کی تعلیم حاصل کی۔ دریں اثنا ان کو ذہنی طور پر کافی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جیسے ۱۹۶۸ء میں ان کے پھپھیرے بھائی، اشوک دلال عرف 'گگو' کی موت ہوئی جوان سے عمر میں صرف بیس دن چھوٹا تھا۔ بقول دیپک بدکی جس دن اشوک کی موت واقع ہوئی اسی رات پہلی بار انھوں نے اپنے ہاتھ میں قلم اٹھایا اور کچھ تک بندی کے علاوہ ایک ڈرامہ 'بندھن' قلم بند کیا جس میں انھوں نے آدھے الفاظ ہندی کے لکھے اور آدھے اردو کے جبکہ تھوڑے بہت الفاظ انگریزی کے بھی استعمال کیے۔ بدکی کی یہ خواہش تھی کہ ان کا یہ ڈرامہ اسٹیج کے ذریعے منظر عام پر آجائے مگر کوششوں کے باوجود ان کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا۔ اس کے بارے میں بدکی نے اپنے مضمون '' حیات کے اہم سنگ میل'' میں وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

'' ۱۹۶۸ء میں پھپھیرے بھائی کی موت ہوئی۔ اس کے ساتھ زندگی کے آخری ایام میں کافی دوستی ہوئی تھی۔ اسی رات گھر آ کر تک بندی کرنے لگا اور رات بھر ایک ڈرامہ 'بندھن' لکھا۔ آدھا ہندی میں لکھا اور آدھا اردو میں، کہیں کہیں انگریزی الفاظ بھی بھر دیے۔ بہت کوشش کی اس ڈرامے کو اسٹیج پر لانے کی مگر کامیابی نہیں ملی۔'' ۱۰

دیپک بدکی کے تخلیقی میدان میں اترنے کے دو اسباب تھے۔ پہلا یہ کہ وہ بچپن ہی سے مصوری میں دلچسپی رکھتے تھے اور اپنی تخلیقی قوّت کا اظہار کرنا چاہتے تھے مگر والدین انہیں ڈاکٹر بنتا دیکھنا چاہتے تھے اس لیے وہ اس شوق کو انجام تک نہیں لے جاسکے۔ یہاں یہ کہنا ضروری ہے کہ بریلی میں جب وہ نوکری کرتے تھے اور آرمی پوسٹل سروس میں کپتان تھے ان دنوں دیپک بدکی نے دوبارہ اس ہابی کو آگے بڑھانے کی کوشش کی اور بقول بدکی کے کئی پینٹنگز اور پورٹریٹ بنائے۔ اتنا ہی نہیں ۱۹۷۱ء میں تعلیم مکمل کرنے کے ترت بعد انھوں نے مقامی اخباروں

(روزنامہ جہان نو، ہفتہ وار عقاب، نوجیون اور ہمارا کشمیر) میں بحیثیت کارٹونسٹ کے بہت کم سمئے کے لیے کام بھی کیا۔ انھوں نے اسی تخلیقی قوت کی ارتقاع کے لیے قلم ہاتھ میں اٹھایا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ انہیں لڑکپن کے دوران کئی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا جس کے سبب ان کی زندگی میں عدم تحفظ اور عدم استحکام پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ انہیں کسی ایک زبان پر اتنی دسترس نہیں تھی کہ وہ معیاری نگارشات تحریر کر سکتے اس لیے ان کو اردو زبان سیکھنے کی خواہش ہوئی۔ انھوں نے اپنی تلاش کے سبب پتہ لگایا کہ سرینگر میں اورینٹل کالج کے نام سے ایک ایوننگ اسکول ہے جہاں پر طلبا کو دوسری ڈگریوں کے علاوہ جامعہ علی گڈھ کی ادیب، ادیب ماہر اور ادیب کامل کی ڈگریاں لینے کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہیں سے بدکی نے جامعہ اردو علی گڈھ کی ادیب اور ادیب ماہر کی ڈگریاں حاصل کیں۔ تخلیق کی تحریک انہیں اپنے ماما آنجہانی مکھن لال نہرو اور ڈی اے وی اسکول کے استاد آنجہانی شمبو ناتھ کاچرو سے ملی تھی کیونکہ دونوں نڈر تھے اور ان کا اسلوب منفرد اور بولڈ تھا۔ اپنے استاد کاچرو صاحب کی باتیں انھوں نے گانٹھ باندھ کر رکھ لی تھیں۔ اس بارے میں ان کا کہنا ہے کہ:

"کاچرو صاحب ہمیں اسکول میں کہتے تھے کہ مضمون لکھتے وقت آدمی کو نڈر اور بے خوف ہونا چاہیے اور اپنا مدعا واضح الفاظ میں مؤثر طریقے سے لکھ دینا چاہیے۔" [۱۱]

دیکھنے کی بات یہ ہے کہ انھوں نے بہت کم وقت میں اردو سیکھی اور پھر اس زبان میں کہانیاں تحریر کرنے لگے۔ انھوں نے ۱۹۷۰ء میں پہلا افسانہ تخلیق کیا، جو 'سلمیٰ' کے نام سے شائع ہوا۔ اس افسانے کو لے کر بدکی روزنامہ 'ہمدرد' کے ایڈیٹر کے پاس گئے اور اس نے دوسرے ہی اتوار کو وہ افسانہ دو قسطوں میں شائع کر دیا۔ افسانے کو شائع ہوتے دیکھ کر دیپک بدکی پھولے نہ سمائے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب وہ بی۔ ایڈ کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ انہی دنوں گاندھی میموریل کالج، جہاں وہ پڑھتے تھے، میں ڈبیٹ کا انعقاد ہوا تھا۔ اس پروگرام میں انھوں نے بھی حصہ لیا تھا۔ حالانکہ صرف ان کا لیکچر سننے کے بعد لوگوں نے تالیاں بجائی تھیں، اور ان تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے پورا ہال گونج اٹھا تھا مگر ان کو انعام نہیں دیا گیا۔ یہی واقعہ اس افسانے کی تحریک بن گیا اور انجام کار 'سلمیٰ' جیسا خوبصورت افسانہ ہمارے سامنے آیا۔ اپریل ۱۹۷۱ء میں دیپک بدکی ریاستی پبلک سیکٹر یونٹ، جموں اینڈ کشمیر ہینڈی کرافٹس سیلز اینڈ ایکسپورٹس کارپوریشن میں ملازم ہو گئے جس کے رٹیل شوروم کشمیر گورنمنٹ آرٹس ایمپوریم کے نام سے ملک کے کئی بڑے شہروں میں موجود ہیں۔ پہلی پوسٹنگ چنڈی گڑھ میں ہوئی اور پھر سال بھر کے اندر ہی ان کا ٹرانسفر ایمپوریم کے اشوکا ہوٹل دہلی برانچ میں ہوا۔ دیپک بدکی ایک حساس مزاج کے مالک ہیں جنھوں نے ہمیشہ خود کو رشوت خوری اور ایسی ہی انسانیت کُش برائیوں سے دور رکھنے کی کوشش کی۔ دراصل ان ساری برائیوں کو

انھوں نے ملازمت کے دوران بہت قریب سے دیکھا اور بقول ان کے کئی بار ان سے سمجھوتا کرنے کی کوشش بھی کی مگر دل نے ساتھ نہیں دیا۔ انہیں یہ سارا ماحول ناگوار لگنے لگا تھا۔ انھوں نے کئی بار نوکری چھوڑنے کا فیصلہ کیا، ایک بار استعفیٰ بھی دیا مگر گھر کی حالت کو دیکھ کے اسے واپس لینے پر مجبور ہو گئے۔ آخر کار سوچے سمجھے طریقۂ کار کے تحت آل انڈیا سروسز کا امتحان پاس کر کے ۱۹۷۶ء میں اس ملازمت کو خیر آباد کہہ دیا۔ بقول بدکی زندگی کے یہ پانچ سال ضائع ہو گئے حالانکہ اس دوران بھی کافی تجربات حاصل ہوئے۔

جیسا پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے بدکی کو ہمیشہ کچھ نہ کچھ نیا سیکھنے، نیا جاننے اور نیا کرنے کا تجسس رہتا ہے اور ان کی اسی عادت سے خوش ہو کر ان کے پھوپھا پنڈت شام لال صراف نے، جو ریاست جموں و کشمیر میں پندرہ سال منسٹر رہے اور پانچ سال ممبر پارلیمنٹ رہے، انہیں کارٹون بنانے کی خاطر اپنے ایک سابقہ رفیق کار راجپوری صاحب کے پاس بھیجا جو ان دنوں ایک روزنامہ 'جہان نو' شائع کرتے تھے۔ یہ سلسلہ زیادہ دیر نہ چل سکا۔ اس کے بعد دو اور اخباروں 'نوجیون' اور 'ہمارا کشمیر' میں کوشش کی مگر کہیں بھی جم نہ سکے۔ آخر میں ان کی دوستی ایک خوشنویس (کاتب) منظور انجم سے ہوئی جو اب اپنا ایک الگ اخبار ہفتہ وار 'عقاب' نکال رہے تھے۔ اس اخبار کے ساتھ انہیں پہلی ہی نظر میں جذباتی رشتہ سا قائم ہو گیا۔ وہاں رہ کر انھوں نے عام شماروں کے علاوہ 'عقاب' کے دو خصوصی شمارے 'عید نمبر' اور 'محرم نمبر' بڑے اہتمام سے نکالے، جن کی ناستلجیائی یادیں اب بھی ان کے دل میں محفوظ ہیں۔ بقول بدکی وہ ایک روز کسی نیوز اسٹال کے پاس کھڑے تھے کہ ایک گاہک آ کر ہفتہ وار اخبار دیکھنے لگا۔ پہلے بنگلور سے شائع شدہ 'نشیمن' اٹھایا، پھر دلی سے شائع شدہ 'نئی دنیا' اٹھایا، دونوں ان دنوں بہت ہی مقبول ہوا کرتے تھے۔ پھر دونوں اخبارات واپس رکھ کر وہ 'عقاب' خرید کر چلتا بنا۔ اس واقعے سے جو خوشی ان کے دل میں ہوئی اسے وہ بیان نہیں کر پاتے۔ دیپک بدکی نے خصوصی عید نمبر کے بارے میں بھی ایک انٹرویو میں مندرجہ ذیل بیان دیا ہے:

> ''خواجہ ثناء اللہ بٹ، ایڈیٹر آفتاب نے عید نمبر کو دیکھ کر ایک مختصر نوٹ لکھ کر بھیجا جو یوں تھا 'اتنا خوبصورت عید نمبر وادی سے پہلی بار شائع ہوا ہے۔ مبارکباد۔'' ۱۲

علاوہ ازیں دیپک بدکی ریڈیو کشمیر سرینگر کی یُو وانی اور جنرل سروسز اور دوردرشن کشمیر کے پروگراموں میں شامل ہوتے رہے۔ ۱۹۷۳ء میں دوردرشن کشمیر نے ان کا تحریر کردہ افسانہ 'ریزے' پروگرام 'ایک کہانی' کے تحت ٹیلی وائز کیا جس کو قیوم وڈیرا نے پروڈیوس کیا تھا۔ اس وقت دوردرشن کشمیر کے ڈائریکٹر اردو کے نامور شاعر جناب مظہر امام تھے جنھوں نے ان کی کافی حوصلہ افزائی کی تھی۔ ۱۹۷۵ء میں دیپک بدکی انڈین سول سروسز کے امتحان میں شریک ہوئے جس میں کامیابی تو ملی مگر نمبر اتنے نہیں ملے کہ آئی اے ایس یا آئی ایف ایس کے لیے انتخاب ہو

جاتا۔ایک تو ناتجربہ کاری کے سبب مضامین کا انتخاب غلط ہوا اور اس پر انٹرویو میں زیادہ نمبر نہیں لا سکے۔ پھر بھی الائیڈ سروسز لسٹ کے رٹن ٹیسٹ میں ان کا پانچواں نمبر تھا۔اختیاری مضامین بوٹنی (علم نباتات)، اردو اور ہسٹری تھے۔اردو میں بہت ہی اچھے مارکس آئے تھے۔اس لیے ان کا انتخاب ۱۹۷۶ء میں انڈین پوسٹل سروسز میں ہوا اور پہلی پوسٹنگ دو سال کے پروبیشن کے بعد اپنے ہی شہر سرینگر میں بحیثیت سینئر سپرانٹنڈنٹ ہوئی۔اتفاق سے ۲۳ جولائی ۱۹۷۶ء کو دیپک بدکی کی شادی لکھنؤ میں پلی بڑھی کشمیری پنڈت لڑکی، بینا رینا، سے ہوئی اور ۲۵ جولائی کو انہیں ٹریننگ کے لیے مصوری جانا پڑا۔شادی میں بدکی نے جہیز لینے سے انکار کیا تھا اور کسی دھوم دھام کے بغیر شادی کا اہتمام ہوا تھا۔ان کے نزدیک زندگی جینے کا ایک الگ ہی مفہوم تھا۔دراصل ان کی زندگی اور سوچ وفکر پر ان کے پھوپھا، صراف صاحب، کا بہت اثر نظر آتا ہے۔ بدکی نے کسی کتاب میں سنسکرت کے مشہور شاعر بھرتری ہری کا یہ قول پڑھا تھا اور بعد میں اس پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کی۔

> ’’ بھرتری ہری نے لکھا ہے کہ زندگی بسر کرنے کے دو ہی طریقے ہیں۔ پہلا طریقہ تو یہ ہے کہ عورت کے پہلو میں آسن جماؤ اور بیکنٹھ کے راستے پر نکل جاؤ اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ گیان دھیان کو جیون ساتھی بنالو۔‘‘ ۱۳

ظاہر ہے کہ بدکی نے انہی خیالات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے خود کو اچھا انسان بنانے کی کوشش کی۔ انھوں نے سماج میں بیداری لانے کے لیے ہی اپنے ہاتھ میں قلم اٹھایا۔اس کی شروعات انھوں نے اپنے گھر ہی سے کی۔عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ خواتین کو شادی بیاہ ہو جانے کے بعد گھر کی چہار دیواری میں زندگی جینے کے لئے مجبور ہونا پڑتا ہے۔لیکن بدکی نے اپنی شریک حیات کو مزید تعلیم حاصل کرنے کی نہ صرف اجازت دی بلکہ اس کے لیے ترغیب بھی دی۔ظاہر ہے کہ وہ اپنی بات کو عملی جامہ پہنانے میں یقین رکھتے ہے۔ جب شادی ہوئی تھی اس وقت ان کی بیوی لکھنؤ یونیورسٹی سے گریجویشن کر چکی تھی لیکن اس کے بعد انھوں نے تین مضامین (سوشولوجی، ہندی ،اکانومکس) میں الگ الگ ایم اے کئے، بی ایڈ اور پھر کیندریہ ہندی سنستھان آگرہ سے ایم ایڈ کی ڈگریاں حاصل کیں۔ بہت وقفے کے بعد انھوں نے کانپور یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے لی۔ ۱۹۷۸ء اور ۱۹۸۱ء میں بدکی کے یہاں دو فرزند پیدا ہوئے۔ ایک کا نام سندیپ ہے اور دوسرے کا نام ونیت ہے۔ ملازمت میں کافی مصروفیات کے باوجود انھوں نے اپنے بچوں کو اچھی تعلیم و تربیت دی۔ سندیپ نے ایم ایس یو، بڑودہ سے ایم اے جرنلزم اور ونیت نے اسپین سے ایم بی اے کر لیا۔ ۱۹۷۹ء سے ۱۹۸۸ء تک آرمی (فوجی) پوسٹل سروسز میں ڈیپوٹیشن کی حیثیت سے کام کرتے رہے اور کپتان کے عہدے سے بڑھتے بڑھتے لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے تک

پہنچ گئے۔فوج کی بدولت انہیں ایسی دور دراز جگہوں پر کام کرنے کا موقع فراہم ہوا جن کے بارے میں عام آدمی سوچ بھی نہیں سکتا ہے۔۱۹۸۸ء میں والد کے انتقال کی وجہ سے وہ واپس اپنے سوِل محکمے میں آ گئے اور دوبارہ کشمیر میں بحیثیت ڈائریکٹر پوسٹل سروسز تعینات ہوئے۔

ادھر مصوری کی ٹریننگ ختم کرکے دیپک بدکی لکھنؤ میں سرکل آفس کے ساتھ منسلک تھے کہ ان کی بھینٹ جناب شمس الرحمٰن فاروقی سے ہوئی جو نہ صرف ان کے افسر تھے بلکہ اردو کے مشہور و معروف نقاد بھی ہیں۔ بقول بدکی ان کے ساتھ قربت فائدہ مند بھی رہی اور غیر فائدہ مند بھی۔فاروقی صاحب ان کو اپنے چھوٹے بھائی کی طرح مانتے تھے۔بدکی نے ایک روز اپنے افسانے فاروقی صاحب کو ان کے تاثرات جاننے کے لیے دکھائے۔دو چار دن کے بعد فاروقی صاحب نے افسانے لوٹا دیے۔ان کی بدنی زبان (Body Language) سے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ انہیں افسانے پسند نہیں آئے۔انھوں نے صرف اتنا کہا''ان میں سے ایک افسانہ 'جاگو' اچھا ہے مگر اس کا آخری پیراگراف غیر ضروری ہے۔'' بدکی نے کچھ ردِ عمل ظاہر کرنے کے بغیر افسانے رکھ لیے۔بدکی تو ویسے ہی فاروقی کی تبحّرِ علمی سے مرعوب ہو چکے تھے،اس پر طرہ یہ کہ اس واقعہ نے ان کے حوصلے اتنے پست کر دیے تھے کہ انھوں نے آگے لکھنا ہی چھوڑ دیا۔اس کے علاوہ افسانے لکھنا ترک کرنے کا ایک اور سبب یہ بھی تھا کہ بدکی کا قلم ہمیشہ اینٹی ایسٹیبلشمنٹ (Anti establishment) رہا ہے اور انہیں خدشہ تھا کہ اس وجہ سے کہیں ان کی نوکری نہ چلی جائے۔اس طرح ۱۹۹۶ء تک بدکی کا قلم خاموش رہا۔ بقول بدکی انہیں فاروقی صاحب کے رویے کا احساس بعد میں ہوا۔ بدکی کے افسانوں میں نہ تو علامتیں تھیں اور نہ ہی جدید طرزِ نگارش۔صرف ایک ہی افسانہ علامتی تھا اور وہ تھا 'جاگو' جو کچھ حد تک فاروقی صاحب کو پسند آیا تھا۔حیرت کی بات یہ تھی کہ افسانہ جاگو ۱۹۹۶ء کے آس پاس رسالہ 'اثبات ونفی' کو بھیجا گیا جس کا مدیر بھی جدیدیت کا علمبردار ہے اور انھوں نے بھی آخری پیراگراف کو حذف کرنے کی اجازت مانگی۔خیر وجوہات جو بھی ہوں سچ تو یہ ہے کہ ایک فکرمند قلم قریباً اٹھارہ سال خاموش رہا۔

اتنا ہی نہیں بلکہ بدکی سے ایک اور غلطی ہوئی۔ غالباً زندگی سے ہار کر یا پھر زندگی کو سبق سکھانے کے لیے انھوں نے اپنی تمام شائع شدہ اور غیر شائع شدہ تخلیقات کو شیلانگ کی پوسٹنگ کے دوران (۸۵۔۱۹۸۴ء) آگ کی نذر کر دیا۔بعد میں جب اس نقصان کا احساس ہوا تو کفِ افسوس ملا۔خیر تو اس بات کی رہی کہ ان کہانیوں کے، جن کو بدکی نے تلف کیا تھا، پلاٹ ان کے ذہن میں محفوظ تھے اور انھوں نے ۱۹۹۶ء کے آس پاس ان کو از سرِ نو لکھا۔ ان کے پہلے افسانوی مجموعے 'ادھورے چہرے' میں وہ سب افسانے شامل ہیں۔

بہر حال لکھنے کی خلش اور لگن دیپک بدکی کے دل و دماغ پر بار بار دستک دے رہے تھے۔اس دوران بدکی نے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں نوکری کی تھی اور وہاں کی زندگی کا مشاہدہ کیا تھا۔نجی زندگی میں بھی کئی طوفان آئے تھے جن کا انھوں نے بڑی ہمت سے مقابلہ کیا تھا اور پھر سب سے بڑا طوفان کشمیر میں دہشت گردی کی شکل میں ۱۹۹۰ء میں آیا جس نے ان کے دل و دماغ کو مختل کر دیا۔ وقتی دباؤ میں آ کر ۱۹۹۰ء میں ان کی ایک کہانی 'آزادی' گیان ساگر کے قلمی نام سے ہند سماچار، جالندھر میں چھپی تھی جس کا مسودہ ان کے پاس نہیں ہے۔اس لیے یہ افسانہ کسی کتاب میں شامل نہیں ہوا ہے۔

۱۹۸۸ء سے ۱۹۹۱ء تک بدکی جموں و کشمیر میں ڈائریکٹر پوسٹل سروسز کے عہدے پر تعینات رہے۔انہی دنوں کشمیر میں دہشت گردی نے اپنا سر ابھارا۔کہیں بھی کوئی محفوظ نظر نہیں آ رہا تھا۔نہ ہندو اور نہ مسلم۔ یہ سارا کھیل سرحد پار رچایا جا رہا تھا۔اس کے سبب محکمہ ڈاک کو کافی نقصان اٹھانا پڑا جس کا مقابلہ بدکی تن تنہا کر رہے تھے۔اس کے علاوہ کشمیر میں رہنے والے کشمیری پنڈتوں کو، جن کی کل آبادی ۵۔۴ لاکھ کے قریب تھی، ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا گیا۔ یہ بدکی کی زندگی کا سب سے خراب اور تلخ دور تھا جسے وہ بھلائے نہیں بھول پاتے۔ دہشت گردوں کی وجہ سے کشمیری پنڈتوں کو اپنے آشیانے تک کو چھوڑ کر جانا پڑا۔جیسے ایک شیشہ جب ٹوٹ جاتا ہے تو وہ ٹکڑوں میں بکھر کر رہ جاتا ہے اور اس کا وجود ختم ہو جاتا ہے، ٹھیک ویسے ہی کشمیر پنڈت مالا کے دانوں کی مانند بکھر گئے اور تب سے اپنے وجود کی لڑائی لڑ رہے ہیں۔ان حالات کے بارے میں دیپک بدکی فرماتے ہیں:

> ''۱۹۸۹ء سے ۱۹۹۱ء تک جموں و کشمیر میں ڈائریکٹر پوسٹل سروسز تھا۔انہی دنوں کشمیر میں دہشت گردی نے سر ابھارا۔محکمہ ڈاک کو سب سے زیادہ نقصان اٹھانا پڑا۔علاوہ ازیں ساری پنڈت برادری کو ہجرت کرنی پڑی۔۱۹۸۹ء میں باغ مہتاب میں نیا گھر تعمیر کرایا مگر ہجرت کے سبب مڑ کر بھی اسے دیکھ نہ سکا ،اس میں رہنے کی تو بات ہی نہیں۔'' [۱۴]

۱۹۹۲ء میں گورنمنٹ نے دیپک بدکی کو نیشنل ڈیفنس کالج میں ایک سال کی دفاعی سٹریٹجی کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجا۔ یہ تعلیم فوجی زندگی میں کسی اعزاز سے کم نہیں مگر یہاں کوئی ڈگری نہیں دی جاتی ہے۔البتہ الہ آباد یونیورسٹی اس کو ایم ایس سی (ڈیفنس اسٹڈیز Defence Studies) کے برابر مانتی ہے۔اس تعلیم کے دوران بدکی نے ہندوستان کے کئی علاقوں جیسے انڈمان و نکوبار، گوا، راجستھان وغیرہ کا دورہ کیا اور ملک کے دفاعی اداروں کی واقفیت بھی حاصل کی۔علاوہ ازیں اس ٹریننگ کے دوران انہیں دبئی، شارجہ، قاہرہ، روم اور پیرس جیسی جگہیں دیکھنے کا موقعہ بھی ملا۔ساتھ ہی ساتھ وہاں کے دفاعی نظام کے بارے میں بھی جانکاری ملی۔ چنانچہ بدکی کی سیاحت

کے بارے میں افتخار امام صدیقی، مدیر شاعر ممبئی فرماتے ہیں :

'' نوکری کی بدولت ہندوستان کے طول وعرض میں گھومتا رہا۔ بیرونی ممالک میں بینگ کاک (تھائی لینڈ)، دبئی (یو اے ای)، قاہرہ (مصر)، روم (اٹلی) اور پیرس (فرانس) کا سفر کیا۔'' ۱۵؎

۱۹۹۳ء سے ۱۹۹۵ء تک وہ محکمہ ڈاک کے تحت پوسٹل لائف انشورنس سے جڑے رہے۔ اسی دوران انھوں نے انشورنس انسٹی ٹیوٹ آف انڈیا، ممبئی کے لائسنس شی ایٹ (Licentiate) اور بعد میں ایسوشی ایٹ شپ (Associateship) کے امتحانات پاس کئے۔ ادھر ملازمت میں بار بار تبادلہ ہونے کے سبب انھیں ہندوستان کے مختلف علاقوں میں کام کرنے کا موقع ملا۔ مثلاً اروناچل پردیش، میگھالیہ (شیلانگ) تریپورا (اگرتلا)، بریلی، متھرا (یوپی)، آسام (گوہاٹی)، گوا، بروڈہ (گجرات)، دہلی، وغیرہ۔ چنانچہ ملازمت کے دوران ان جگہوں پر رہنے کا اور ان کو جاننے کا موقع ملتا تھا۔ اس کے علاوہ ان جگہوں کی تہذیبی وراثت، رسم ورواج، سیاسی وسماجی حالات اور لوگوں کے رہن سہن اور طور طریق کا مشاہدہ کرنے کا موقعہ بھی ملا۔ انھوں نے جو کچھ بھی تجربات ومشاہدات حاصل کئے، وہ آخر کار ان کے تخلیقی کام کا اہم حصہ بن گئے۔ اور انہی مختلف تجربات نے کہیں نہ کہیں ان کے افسانوں میں جان ڈالنے کا کام بھی کیا۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ جغرافیائی لحاظ سے ایسا تنوع شاید ہی کسی دوسرے افسانہ نگار میں مل جائے۔ اس سلسلے میں فیاض احمد وجیہہ کو دیے گئے انٹرویو میں افسانہ نگار فرماتے ہیں:

'' ہاں کچھ حد تک میں نے ملازمت کے دوران ہندوستان کی بہت ساری جگہیں دیکھ لی ہیں۔ کشمیر سے اروناچل پردیش تبادلے ہوتے رہے۔ افسوس کہ نوکری ایسی ملی کہ عام لوگوں سے اٹھنا بیٹھنا اور ان کے غم اور خوشی میں شریک ہونا ممکن نہیں تھا۔ فوج میں بھی نو سال گزارے۔ وہاں تو آدمی بالکل ہی کٹ کر رہ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میری کہانیوں کے اکثر وبیشتر کردار متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ البتہ موجودہ نوکری سے پہلے مجھے کچھ مواقع ضرور ملے تھے اور میں نے ان کا بھرپور فائدہ اٹھالیا۔ ان کے بارے میں میں نے دو چار افسانے رقم کئے ہیں۔ میری کہانیوں میں بہرحال تجربے اور مشاہدے کا خاصا دخل ہوتا ہے مگر کہانیاں صرف واقعات کا بیان نہیں ہوتیں۔ میں ان تجربات اور مشاہدات سے استفادہ کر کے تخئیل کی دنیا میں اڑان بھرتا ہوں اور ان کہانیوں کو نئے جہات عطا کرتا ہوں۔'' ۱۶؎

دیپک بدکی کی شخصیت پر کئی ہستیوں کا اثر پڑا ہے۔ انھوں نے کالج کے دنوں میں گاندھی جی کا لٹریچر خوب پڑھا تھا اور اسے کافی متاثر ہو چکے تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ان کے پھوپھا بھی گاندھی وادی تھے اور بدکی کو گاندھی جی کے بارے میں اکثر درس دیا کرتے تھے۔ دوسری وجہ تھی خود بدکی کی اپنی شخصیت جو اس نظریے سے زیادہ میل کھاتی تھی۔ اس کا یہ بھی مطلب نہیں کہ وہ گاندھی جی کی اندھی تقلید کرتے ہیں۔ جن باتوں پر انہیں گاندھی جی سے

اختلاف ہے، وہ دوٹوک کہتے ہیں۔ان کی کہانیوں سے بھی اس بارے میں پتہ چلتا ہے۔ملاحظہ ہوان کی ایک دل گداز کہانی ’کئی گاندھی اور‘۔ویسے بھی خودان کی زندگی آئینے کے مانند بالکل صاف وشفاف ہے۔

جہاں تک ادبی شخصیات کا تعلق ہے، دیپک بدکی پر سب سے زیادہ اثر منٹو، پریم چند، موپاسان، آئن رینڈ اور خلیل جبران کی تخلیقات کا پڑا ہے۔ان شخصیات کا اثر بدکی کے فن اور شخصیت دونوں پر نمایاں طور سے نظر آتا ہے۔ چاہے وہ ان کی ذاتی زندگی سے متعلق ہو، یا سماجی زندگی سے جڑی ہوئی کوئی بات ہو۔افتخار امام صدیقی، مدیر ماہنامہ شاعر ممبئی نے دیپک بدکی سے ہوئے مکالمے کا حوالہ دیتے ہوئے ’فنکار اب بھی مستور ہے مکالمہ دیپک بدکی سے‘ میں یوں لکھا ہے:

”س : ملکی زبانوں کے ادب میں چند اہم ترین نام ؟

ج : پریم چند، منٹو، بیدی، کرشن چندر، عصمت چغتائی، غالب اور اقبال

س : غیر ملکی زبانوں کے ادب کے چند اہم ترین نام؟

ج : آئین رینڈ، خلیل جبران، موپاساں، چیخوف، دوستووسکی ۔“ ۱۷

ان قلم کاروں کے علاوہ بھی بدکی نے ان گنت کتابوں کا مطالعہ کیا ہے جن کی الگ الگ تفصیل دینا مناسب نہیں۔یہی کیا کم ہے کہ انھوں نے دوسرے قلم کاروں کی نگارشات پر تبصرے اور تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں جو عصری تحریریں (۲۰۰۶ء)، عصری شعور (۲۰۰۹ء) اور عصری تقاضے (زیر طبع) میں شامل ہیں جن میں تقریباً ۲۰۰ کتابوں پر تبصرے شامل ہیں۔ان کتابوں کو انھوں نے اوّل تا آخر پڑھا ہے۔منٹو کی تحریروں سے ان کا سامنا یوں ہوا کہ ڈاکٹر برج پریمی نے منٹو پر ریسرچ کر کے مقالہ لکھا تھا جس کی دوتہائی کتابت بدکی نے کی اور اس طرح انہیں بھی منٹو میں دلچسپی پیدا ہوگئی۔اس مقالے کے ابواب پر منٹو کی تصویریں بھی بدکی نے ہی بنائی تھیں۔ بقول بدکی جن چند ایک کتابوں سے وہ متاثر ہو چکے ہیں ان کے نام یوں ہیں۔ اگنی اینڈ دی اکسٹیسی (Agony & the Ecstasy)، دی فیوچر شاک (The Future Shock)، ایٹلس شرگڈ (Atlas Shrugged) دی فاونٹین ہیڈ (The Fountainhead)، دی پروفٹ (The Prophet) وغیرہ۔ بدکی معروف پینٹر و مجسمہ ساز مائیکل اینجلو کی حیات اور فن سے بھی بے حد متاثر ہیں۔ان کتابوں میں مختصر افسانوں کے مجموعوں کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔

یہ سچ ہے کہ دیپک بدکی نے ۱۹۷۰ء سے لکھنا شروع کیا مگر انھوں نے اٹھارہ سال (۱۹۷۸-۹۶ء) کے دوران

کچھ بھی قلم بند نہیں کیا۔ستّر کے دہے میں ان کی لکھی ہوئی تخلیقات ضائع ہوگئیں اور انھوں نے ان افسانوں کو از سرِ نو لکھا۔اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کا شمار آٹھویں دہائی کے بعد کے لکھنے والوں میں کیا جانا چاہیے۔البتہ اگر ذہنی نمو اور نظریے کی بنیاد پر دیکھا جائے تو وہ ترقی پسند ادب کے زیادہ قریب نظر آتے ہیں گو انھوں نے اپنے آپ کو کبھی کسی گروہ کے ساتھ نہیں جوڑا۔انھوں نے جس طرح جذبات میں بہہ کر اپنے سبھی افسانوں اور مسودوں کو نذرِ آتش کر دیا تھا ۱۹۹۶ء کے بعد وہی چنگاریاں آگ میں تبدیل ہوکر دوبارہ بھڑک اٹھی ہیں۔اسی آگ کی وجہ سے بدکی نے بہت کم وقت میں چار افسانوی مجموعے اردو ادب کو عنایت کیے۔ان کے یہاں ایک طرف جذبات کا شعلہ و آتش تھا تو دوسری طرف ملازمت کی مصروفیات تھیں۔ مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ افسانوں کا تلف ہونا ایک طرح سے اچھا ہی ہوا کیوں کہ بعد میں جو افسانے از سرِ نو لکھے گئے ان میں نہ تو کچّا پن کہیں دکھائی دیتا ہے اور نہ ہی کہیں فن کی کمی محسوس ہوتی ہے۔اس کے علاوہ اس وقفے کے اندر ان کے خیالات مطالعے اور مشاہدے کے سبب وسیع تر ہوگئے ۔ویسے بھی مغربی فن و ادب کا اثر ہندوستان پر اور یہاں کے ادیبوں و فنکاروں پر اپنی چھاپ چھوڑ جاتا ہے۔اسی طرح مغربی ادب میں کروٹوں کی باعث ہمارے آج کے افسانے میں کافی تبدیلیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔دیپک بدکی نے اپنی ایک تحریر 'حرف حرف دیپک بدکی'، جو شاعر کے خصوصی گوشے میں چھپی تھی، میں کہانی کو لے کر اپنے تاثرات یوں قلم بند کئے ہیں:

> ''اردو کہانی آج ایسے دوراہے پر کھڑی ہے جہاں ایک جانب تیز رفتار مغربی فکر و عمل ہے اور دوسری جانب چیونٹی کی چال چلتا ہوا سست رفتار مشرقی معاشرہ ہے۔ایک طرف جمہوریت اور انسانی حقوق کی پامالی، نسائی آزادی، مصنوعی تولد، کرائے کی کوکھ، اور لزبین کلچر اور کلوننگ کی باتیں ہو رہی ہیں، دوسری طرف بنیادی حقوق کی پامالی، اقلیتوں پر ظلم و ستم، طبقاتی نابرابری، عورتوں اور بچوں اور خاص کر لڑکیوں کا جنسی استحصال، لڑکیوں کو درس گاہوں سے دور رکھنے کی سبیلیں، پردے کے نفاذ کے لئے تیزاب کا استعمال، رشوت خوری، اقربا پروری اور غنڈہ گردی اب تک جاری و ساری ہے۔''۱۸

جیسا کہ پہلے بھی تحریر کیا گیا ہے کہ بدکی نے پوسٹل سروس میں آنے کے بعد چند وجوہات کی بنا پر لکھنا ترک کر دیا تھا اور یہ تعطل ۱۸ سال چلتا رہا۔لیکن ذہنی کش مکش کے سبب انھوں نے دوبارہ ۱۹۹۶ء کے آس پاس لکھنا شروع کیا۔حالانکہ پہلے مرحلے میں انھوں نے جو افسانے لکھے تھے وہ مختلف مقامی اخباروں اور چند غیر ریاستی رسالوں میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے۔لہٰذا یہ ضروری ہے کہ ان کی پرانی تحریروں کو روزنامہ آفتاب سرینگر، روزنامہ ہمدرد سرینگر، ہفتہ وار رفتار جموں، نشیمن سرینگر، ہفتہ وار عقاب سرینگر، پولیٹکل ٹائمز سرینگر، ماہنامہ تعمیر سرینگر، ماہنامہ تعمیر ہریانہ چنڈی گڈھ، سینک سماچار دہلی وغیرہ کی فائیلوں سے ڈھونڈ کر نکالا جائے تاکہ ان کے فن

کی ارتقائی منزلوں کا اندازہ ہو سکے۔ اپنی فنی بازیافت کے بارے میں دیپک بدکی یوں رقم طراز ہیں:

'' یوں تو نوکری کے سبب ۱۹۷۶ سے ہی لکھنا بند کر دیا تھا۔ کیونکہ میں جو بھی لکھتا ہوں اس میں (Anti Establishament) کی بو آتی ہے اور یہی وجہ تھی کہ میں نے لکھنا ترک کر دیا۔ مگر یہ چنگاری میرے وجود میں دب کر رہ گئی تھی اور ۱۹۹۶ء میں قُقنس (Phoenix) کی مانند پھر سے شعلہ بن گئی۔'' ۱۹

دیپک بدکی نے اپنے علم و فن کو محدود نہیں رکھا ہے۔ وہ کشمیری، اردو، انگریزی، اور ہندی زبانوں سے واقف ہیں۔ علاوہ ازیں ہسپانوی اور بنگلہ زبان سیکھنے کی بھی کوشش کی تھی مگر مصروفیات آڑے آئیں۔ سائنس کے طالب علم ہونے کے سبب انھوں نے کئی سائنسی مضامین جیسے بیالوجی، فزکس، کیمسٹری، فزیولوجی وغیرہ پر دسترس حاصل کی ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے نوکری کے دوران انھوں نے منیجمنٹ اسٹڈیز، انشورنس، اور ڈیفنس اسٹڈیز کی تعلیم بھی حاصل کی ہے۔ طالب علمی کے زمانے میں ایم ایس سی تک وہ تعلیم کو سنجیدگی سے نہیں لیتے تھے۔ خود ہی بتاتے ہیں کہ ان کا زیادہ وقت گھر سے باہر ہی گزرتا تھا۔ بچپن میں زیادہ تر کرکٹ کھیلنے میں وقت برباد کرتے تھے جس پر والدین بہت ناراض ہوتے تھے کیونکہ ان دنوں کرکٹ میں اتنا پیسہ نہ تھا۔

ایسا ہی حال دیپک بدکی کی کہانیوں کا بھی ہے۔ انھوں نے نہ صرف اردو انیس سال کی عمر میں سیکھی بلکہ ساتھ ہی ساتھ افسانے لکھنا بھی شروع کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کا تحریری کام بڑھتا چلا گیا۔ آئے دن کسی نہ کسی اخبار یا رسالے میں ان کا افسانہ شائع ہونے لگا۔ ان کے افسانے نہ صرف کشمیر بلکہ ملکی اور غیر ملکی جرائد میں چھپنے لگے۔ جس طرح برسات میں بارش کی بوندیں زمین پر پڑتے ہی مٹی کی بھینی بھینی خوشبو دھیرے دھیرے ماحول میں پھیلاتی ہیں اسی طرح بدکی کے افسانے قاری کے ذہن پر ایک عطر بیز اور خوشگوار احساس چھوڑتے ہیں۔ ان کے افسانوں کی خوشبوئیں ہندوستان پاکستان اور اردو کی نئی بستیوں میں پھیل چکی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کہانیوں کو جلدی ہی کتابی صورت میں منظر عام پر لانا پڑا۔

۱۹۹۹ء میں پہلا افسانوی مجموعہ 'ادھورے چہرے' کے نام سے منظر عام پر آیا۔ اس افسانوی مجموعے میں چھوٹے بڑے ملا کر کل سولہ افسانے شامل ہیں۔ اس مجموعے کی خاص بات یہ ہے کہ ایک افسانہ دوسرے افسانے سے الگ تھلگ ہے، چاہے وہ تھیم کے لحاظ سے ہو یا پھر موضوع کے لحاظ سے۔ اس بات پر مشہور ادیب مانک ٹالا اس طرح سے روشنی ڈالتے ہیں:

'' ادھورے چہرے بدکی صاحب کے افسانوں کی پہلی کتاب ہے۔ جو ۱۹۹۹ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں ان کے ایک سے بڑھ کر ایک معیاری افسانے شامل ہیں۔'' ۲۰

دیپک بدکی نے جس وقت سے افسانے لکھنا شروع کیا تھا اس وقت جدیدیت کا بول بالا تھا اور افسانوں میں علامتوں کا استعمال خوب زور وشور سے ہورہا تھا لیکن انھوں نے مصلحتاً نہ رومانی تحریک، نہ ترقی پسند تحریک، نہ نفسیاتی تحریک اور نہ ہی جدیدیت کے ساتھ رشتہ جوڑا بلکہ اپنی ایک منفرد راہ ڈھونڈ نکالی حالانکہ وہ ترقی پسندی اور نفسیاتی تحریک سے بہت قریب رہے۔ یہ بھی نہیں کہ انھوں نے علامات اور استعارات کے تصرف سے یکسر گریز کیا بلکہ ان کے افسانوں میں کئی علامتیں اور استعارے ملتے ہیں جو افسانے کی روح کے طور پر کام کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ڈرفٹ وڈ ، کالا گلاب، راکھ کا ڈھیر وغیرہ۔ ان کے تین افسانے: رشتوں کا درد، جاگو اور ادھورے چہرے۔ کسی بھی دور جدید کے افسانے کے مقابلے میں رکھے جا سکتے ہیں۔ ان تینوں افسانوں کی طرز نگارش جدید افسانوں کی کسوٹی پر کھرا اترتا ہے۔ غرض یہ کہ بدکی نے ادبی دنیا کے ایسے دور میں اپنا قدم رکھا جب کہانیوں کا انحصار کہانی پن سے زیادہ علامتوں پر ہوتا تھا لیکن انھوں نے اپنے افسانوں میں علامتوں کے ساتھ ساتھ کہانی پن اور بیانیہ کی طرف بھی خاصی توجہ دی۔ رشتوں کا درد، ادھورے چہرے، خودکشی، بٹی ہوئی عورت، وغیرہ اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ بدکی نے اپنے افسانوں میں زندگی کے الگ الگ زاویوں، تجربوں، اور مشاہدوں کو پیش کیا ہے خاص طور سے موجودہ دور میں جو حالات، واقعات اور حادثات رونما ہوتے رہتے ہیں ان سے جڑے سبھی مسئلوں کو کامیابی سے بیان کیا ہے۔

اس کے علاوہ اس مجموعے میں خاص طور سے سماج کے اہم گروہ یعنی عورتوں کے الگ الگ رنگ وروپ اور ان کی امیدوں اور خواہشوں کو اجاگر کیا ہے۔ اس طبقے پر لکھنا بہت ضروری ہے کیونکہ عورتیں آنے والی نسلوں کا وجود ہوتی ہے۔ رفیق شاہین بدکی کے افسانوں پر اپنے تاثرات یوں پیش کرتے ہیں:

'' دیپک بدکی کے افسانے اگر ایک طرف بے جوڑ شادیوں اور طلاق کے سخت قوانین پر طنز کرتی ہیں تو دوسری طرف سماج کے ایسے افراد کو بھی روشنی میں لے آتی ہیں جو نفسیاتی طور پر غیر نارمل (Abnormal) ہیں اور جو ازدواجی زندگی کی نارمل قسم کی عمومی خوشیوں سے لطف اندوز ہونے کے بجائے آپسی تقابل کے جذبے کو ہوا دے کر میاں بیوی کے درمیان خود ہی فاصلے کی دیوار بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں. کہانی ''ڈرفٹ وڈ '' اس نوع کی اہم کہانی ہے جو ایک باپ کے اپنی کم سن بیٹی سے جنسی تعلق کو ظاہر کرتی ہے۔ ایک دیگر کہانی میں ایک بہنوئی بھی اپنی سالی سے جنسی بے تکلفی قائم کر لیتا ہے۔ یہاں جنسی بھوک اور جسم کی ضرورت جنسی تکمیلے کی راہ میں آڑے آنے والے مقدس رشتوں کو پائمال کرتے خود کو سامان تسکین بہم پہنچا کر ہی دم لیتی ہے۔ '' ۲۱

جس طرح پیلے رنگ میں نیلا رنگ ملانے سے ایک نیا رنگ۔ ہرا رنگ پیدا ہوتا ہے ویسے ہی دیپک بدکی کے افسانوں کا حال ہے۔ ان کے کلر پیلیٹ پر طرح طرح کے رنگ ہیں جن کو ملا کر وہ ایک نیا رنگ پیدا کرتے ہیں اور

ایک نئی تصویر قاری کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ان کے افسانوں میں زندگی کا ہر رنگ نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ پھر چاہے وہ انسانی زندگی کے درد و تکلیف کا حقیقی عکس ہو یا پھر جھوٹ و فریب کاری سے بنائے ہوئے مکڑی کے جالے ہوں یا پھر ایسے کردار ہوں جو زندگی کے ہر موڑ پر آئے دن دکھائی پڑتے ہیں۔انھوں نے اپنے افسانوں میں نفسیاتی و جنسیاتی موضوعات کو بھی کھل کر اور الگ الگ انداز میں پیش کیا ہیں۔انھوں نے جو کچھ بھی لکھا ہے وہ ان کی محنت و ایمانداری کا ہی نتیجہ ہے اور اس میں جنسی تلذّذ یا جذبات بھڑکانے کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا۔ڈاکٹر خان حفیظ نے اپنے مضمون'' دیپک بدکی...قابل ذکر افسانہ نگار'' میں تحریر کیا ہے:

'' دیپک بدکی ابتداء سے ہی مختلف رنگوں کے تار و پود سے اپنے افسانے کی بنت تیار کرتے ہیں اور افسانے سے متعلق اپنی اختراع کی ہوئی تکنیک کو برمحل استعمال کرتے ہوئے موضوع کے اعتبار سے الفاظ کو منتخب کر کے اسے نگینہ کی طرح جڑ دیتے ہیں۔لہٰذا ان کے افسانوں میں ایک قسم کے ندرت پیدا ہو جاتی ہے۔ '' ۲۲

ظاہر ہے بدکی پہلے افسانوی مجموعے 'ادھورے چہرے' کے شائع ہو جانے کے بعد بھی بدستور افسانے لکھتے رہے ۔تاہم ملازمت کے دوران وہ کشمیر کے علاوہ ملک کے بہت سارے شہری اور نیم شہری علاقوں میں رہنے کے لیے مجبور ہو گئے جس کے سبب مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کو جاننے کا اسے موقع فراہم ہوا۔ایسا ہی ایک موقعہ انہیں وڈودرہ (بڑودہ) گجرات کی پوسٹنگ نے بھی فراہم کیا جسے وہ بھولے نہیں بھلا پاتے ہیں۔یہاں پر کام کے ساتھ ساتھ وہ انسانی زندگی کے ایک نئے اور انوکھے پہلو سے روشناس ہوئے۔یہاں رہ کر انہیں زندگی کا وہ سکون حاصل ہوا، جو شاید پہلے کسی اور شہر میں دیکھنے کو نہیں ملا تھا۔ یہاں نابالغ لڑکیاں اور خواتین نوراترا کے دنوں میں رات رات بھر خوبصورت لباس پہن کر آزادانہ طور پر گھومتی پھرتی نظر آ رہی تھیں۔نہ کوئی ڈر نہ کوئی خوف۔نہ کسی کی سیٹی اور نہ کسی کی نظر بازی۔لوگوں میں ایک دوسرے کے لیے انسانیت، ہمدردی اور محبت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا دکھائی دیا۔لیکن ۲۰۰۲ء میں گجرات میں اچانک فسادات کا سلسلہ شروع ہوا۔گجرات کے تمام علاقے اثر انداز ہوئے خاص کر بڑودہ جہاں پر بدکی رہائش پذیر تھے۔اس شہر کے پرانے علاقے کا تو نقشہ ہی بدل گیا تھا۔ہندو مسلم فسادات میں بے گناہوں کا خون بہایا گیا۔قتل و غارت، آگ زنی، بہیمیت کا تانڈو رات بھر ہوتا رہا۔ان حالات کو دیکھ کر انہیں اپنے آبائی وطن کشمیر میں ہوئے دہشت گردی کے دل دہلانے والے مناظر آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے۔دیکھتے ہی دیکھتے سارے ماحول میں رنج و غم چھا گیا تھا اور بے قصوروں کی چیخ و پکار سنائی دے رہی تھی۔یہی سارے مناظر انہیں بڑودہ میں بھی دیکھنے کو ملے اور ان کے دل و دماغ پر ایک ساتھ کئی سوالات ابھرنے لگے۔کیا یہ

وہی علاقہ ہے جہاں انسانیت کی تقدیس کے نغمے سنائی دیتے تھے اور خاص طور پر جہاں خواتین کو دیوی کا درجہ دیا جاتا تھا؟ کیا یہ وہی جگہ ہے جہاں پر رہنے والے ملنسار لوگوں کی مثالیں دی جاتی تھیں؟ کیا وہ سب ایک سراب تھا؟ ان سبھی واردات کا بدکی پر کافی اثر پڑ گیا تھا۔اس کا اظہار انھوں نے سلطانہ مہر، جو گجراتی میمن خاندان سے تعلق رکھتی ہیں اور اب برمنگھم میں رہتی ہیں، کو تحریری طور پر کیا اور سلطانہ مہر نے ان خیالات کو اپنے تذکراتی مضمون میں لکھ کر اپنے تذکرے 'گفتنی' میں 'دیپک بدکی ... بڑودہ، گجرات، ہندوستان' کے عنوان کے تحت کرلیا۔اقتباس ملاحظہ ہو:

"بہت ہی شانت جگہ تھی، لوگ امن پسند اور شریف الذات لگ رہے تھے۔نوراترا کے دنوں میں لوگ رات رات بھر گھومتے رہتے تھے۔سڑکوں پر عورتیں اور لڑکیاں بنا خوف وخطر چلتی پھرتی تھیں۔سوچا، چلو خدا کو ترس آ گیا، کچھ سال آرام سے کٹ جائیں گے۔یکا یک نہ جانے کیا ہوا کہ چاروں طرف آگ سی لگ گئی۔ہندو مسلم فسادات نے سر اٹھایا اور گجراتی مسلمانوں کو جان و مال کا نقصان اٹھانا پڑا۔ مسلمان ہزاروں کی تعداد میں اپنے گھر چھوڑ کر راحت کیمپوں میں جمع ہو گئے۔وہ (کشمیر) تھا مسلمانوں کا جبر اور یہ ہے ہندوؤں کا جبر۔آپ ہی بتایئے کسے تہذیب یافتہ کہیں۔پھر بھی شیش محلوں میں رہنے والے لوگ انسان کو اشرف المخلوقات کہہ رہے ہیں۔ ہیومن رائٹس (حقوق انسانی **Human Rights**) کی باتیں کر رہے ہیں۔تہذیب واخلاق کی باتیں کر رہے ہیں۔عالمی گاؤں (**Global Village**) اور گلوبلائزیشن (ہمہ جہتی **Globalisation**) کی باتیں کر رہے ہیں۔کس کو دوشی ٹھہرائیں، کسے معصوم؟ دراصل ظلم و جبر انسان کی خصلت میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ جسے جہاں موقعہ ملتا ہے وہیں اس ہتھیار کو آزماتا ہے، محض اپنی خودغرضی کے لیے یا پھر اپنی انا کی تسکین کے لیے۔" ۲۳

بہر حال زندگی کا سفر اس سنہرے خواب کی مانند ہوتا ہے جس کو انسان ہر وقت، سوتے جاگتے، دیکھنا پسند کرتا ہے۔اس سفر سے وابستہ بہت سی کھٹی میٹھی یادیں ہوتی ہیں جنہیں وہ اپنے سینے سے لگائے پھرتا ہے۔چاہے وہ ملازمت کا سفر ہو یا پھر اپنے گھر پریوار کے ساتھ بتائے گئے دن ہوں۔ یوں تو بدکی ملازمت کی بدولت بہت سی جگہوں پر طعینات رہے اور اس طرح وہ اپنے تجربات و مشاہدات میں مسلسل اضافہ کرتے رہے۔انھوں نے اپنی زندگی کے سفر کے دوران پیش آئے اچھے برے لمحات اور کھٹی میٹھی یادوں کو اپنے افسانوں میں بڑی دردمندی اور ہنرمندی کے ساتھ ایسے قید کیا کہ قاری کو وہ افسانے سوانحاتی گوشے لگنے لگے۔غرض یہ کہ وہ اپنی کہانیوں کی وساطت سے نہ صرف خود بیتے ہوئے لمحات کو جیتے ہیں بلکہ قارئین کو ان کی سیر بھی کراتے ہیں۔البتہ کچھ یادیں اتنی ناخوشگوار گزری ہیں کہ جن کا ذکر کرتے ہوئے زبان لڑکھڑاتی ہے۔بدکی نے اپنی آنکھوں سے کشمیر کی دہشت گردی دیکھی ، گجرات

کے ہندو مسلم فسادات دیکھے، آسام، میزورام اور تریپورا کی ملی ٹینسی دیکھی اور کچھ گجرات اور کشمیر کے دل دہلانے والے زلزلے دیکھے، پھر کیسے ممکن ہے کہ ان کا حساس ذہن ان حالات کو کینواس پر نہیں اتارتا۔ پہلے مجموعے کے بعد بدکی کے کئی اور افسانوں کے مجموعے منظر عام پر آئے۔ ان کے کام کو سراہتے ہوئے تین معیاری رسالوں میں ان کے گوشے شائع ہوئے جو بذاتِ خود ان کی خدمتوں کا اعتراف ہے۔ گوشوں کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

'' ۱) ماہنامہ شاعر، ممبئی ....ستمبر ۲۰۰۴ء .... جلد ۵۷ ، شمارہ ۹

۲) سہ ماہی انتساب، سرونج، مدھیہ پردیش.........۲۰۰۶ء.... جلد ۲۵ ، شمارہ ۶۳

۳) سہ ماہی اسباق، پونے.......................جولائی تا ستمبر ۲۰۰۷ء............... جلد ۲۷ '' ۲۴

۲۰۰۴ء میں مشہور اردو ادبی ماہنامہ 'شاعر ممبئی' میں ان کے تازہ ترین دو افسانے شائع ہوئے۔ ان میں سے ایک افسانے کا نام 'گھونسلا' تھا اور دوسرے افسانے کا نام 'زیبرا کراسنگ پر تنہا آدمی' تھا۔ دراصل افسانہ نگار نے دوسرے افسانے کا عنوان 'زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی' رکھا تھا، جو ان کے حال ہی میں آئے ہوئے افسانوی مجموعے کا عنوان بھی ہے، مگر نہ جانے کیا سوچ کر مدیر شاعر نے اس عنوان کا ایک لفظ بدل دیا۔ ان دونوں افسانوں میں انھوں نے اپنے علم و ہنر، غور و فکر، وسیع مطالعے اور عمیق مشاہدے کا ثبوت دیا ہے۔ دونوں افسانوں نے قارئین کو حد سے زیادہ متاثر کیا جس کا ثبوت ان خطوط سے ملتا ہے جو قلم کار کو بالواسطہ (شاعر کے ذریعے) یا بلاواسطہ ملے۔ افسانہ گھونسلا کے شدّت تاثر کو مندرجہ ذیل اقتباس سے محسوس کیا جا سکتا ہے:

'' ایک اور خاتون رائٹر نے 'گھونسلا' پر اپنا ردعمل ظاہر کرتے ہوئے لکھا کہ 'آپ کتنے پتھر دل ہیں۔ آپ نے وہ گھونسلا کیوں توڑا۔' ان کے الفاظ میں جو شدت تھی اور میری کاروائی کے خلاف ان کے دل میں جو نفرت پیدا ہوئی تھی میں اس کی شدت کو محسوس کر سکتا تھا۔ میں اسے کیسے سمجھا تا کہ میں تو محض اس کہانی کا کردار تھا۔ میں وہاں 'دیپک بدکی' نہیں تھا۔ محض ایک عام انسان تھا اور میں نے وہی کیا جو ایک عام انسان ایسی حالت میں واجب سمجھتا ہے۔'' ۲۵

قارئین کا ردعمل، مثبت یا منفی، پڑھ کر بدکی کو قاری کے دل و دماغ تک پہنچنے کا راستہ مل جاتا ہے یعنی وہ قاری کے کتنے قریب ہے اس کا پتہ چلتا ہے اور اچھے افسانہ نگار کی سب سے بڑی خوبی یہی ہوتی ہے کہ وہ قاری کو محظوظ کرے اور اس کے اندر افسانے کی داد دینے کا احساس جگائے۔ بدکی نے قاری سے تعامل کے لیے ہمیشہ بیانیہ کا سہارا لیا اور ترسیل کے المیے سے اپنے افسانوں کو بچائے رکھا۔ وہ اب تک فعال ہیں اور گاہے بہ گاہے ان کے افسانے جریدوں میں نظر آتے ہیں۔ آج کل وہ سوشل میڈیا کا بھی خوب استعمال کرتے ہیں۔ ان کے اپنے دو بلاگ ہیں (deepakbudki.com/wp-login.php&budki.blogspot.com) جن پر نہ صرف ان

کے افسانے آن لائن پڑھنے کو ملتے ہیں بلکہ ان کے انگریزی مضامین بھی ملتے ہیں۔ان کا لکھنے کا کام برابر جاری و ساری ہے۔سوشل میڈیا کی مناسبت سے اب انھوں نے افسانچے یا منی کہانیاں لکھنا بھی شروع کیا ہے۔

دیپک بدکی کا دوسرا افسانوی مجموعہ' چنار کے پنجے' کے نام سے ۲۰۰۵ء میں شائع ہوا۔جس میں کل انیس (۱۹) افسانے شامل ہیں۔اس افسانوی مجموعے میں زیادہ تر افسانے بدکی کی زندگی کے بہت قریب ہیں کیونکہ ان کا پس منظر کشمیر ہے۔جب کوئی فن کار اپنا فن پیش کرتا ہے، وہ اپنے فن کے ساتھ ساتھ اپنی دھرتی کی بو باس بھی اس فن میں کہیں نہ کہیں چھوڑ دیتا ہے۔فرق صرف اتنا ہے کہ اچھا ادیب اپنے اعلیٰ پایہ تخلیقی کام سے نام کماتا ہے اور امر ہو جاتا ہے جبکہ کم پایہ ادیب وقت کی آندھی کے ساتھ بہہ کر جلدی غائب ہو جاتا ہے۔اس افسانوی مجموعے میں بہت سے افسانوں کے موضوعات کشمیر کے موجودہ حالات و معاملات سے جڑے ہوئے ہیں۔اس مجموعے میں افسانہ نگار کی حب الوطنی سامنے آئی ہے کیونکہ وہ اپنے وطن عزیز سے بے حد پیار کرتے ہیں۔دیپک بدکی نے اچھے برے سبھی واقعات و حادثات کو اپنے افسانوں میں بڑی دقیقہ شناسی، معنویت اور مقصدیت کے ساتھ پیش کیا ہے۔اس مجموعے کے بارے میں سید ظفر ہاشمی، مدیر گلبن، لکھنؤ یوں رقم طراز ہیں:

> '' چنار کے پنجے' دیپک بدکی کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ہے جس میں ۱۹ افسانے شامل ہیں۔
> ان میں بیشتر مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ فاضل مصنف کشمیر کے رہنے والے ہیں۔
> کشمیر کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات نے انہیں کبیدہ خاطر بنا دیا ہے جو فطری ہے اور جس
> کا اظہار انھوں نے اپنے کئی افسانوں میں بڑے جذباتی، دردمندانہ اور اثر انگیز پیرائے میں کیا
> ہے کشمیر کے پس منظر میں بعض کہانیاں انھوں نے اپنے خون جگر سے لکھی ہیں۔'' ۲۶

دراصل بدکی نے اس افسانوی مجموعے' چنار کے پنجے' میں اپنی ذاتی زندگی سے وابستہ حقیقی تجربات کو بڑی مہارت سے افسانوی جامہ پہنا کر پیش کیا ہے۔والد کے انتقال کے بعد وہ کافی وقت تک کشمیر میں ہی تعینات رہے اور اسی دوران وہاں اچانک دہشت گردی اور فرقہ واریت نے سر اٹھایا۔انسان انسان کا دشمن بن بیٹھا۔ چنانچہ انھوں نے ان سارے مناظر کو اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتے ہوئے دیکھا، اس لیے ان سب کا عکس ان کے افسانوں میں جا بجا دیکھنے کو ملتا ہیں۔مثلاً' ایک نہتے مکان کا ریپ، چنار کے پنجے، مخبر، سفید کراس اور کتا وغیرہ۔ان افسانوں کے تناظر کے بارے میں یہ وضاحت کرنا ضروری ہے کہ ایک ہی منظر کو دیکھ کر دو اشخاص ایک ہی نتیجے پر نہیں پہنچتے۔ مجھے وہ کہانی یاد آتی ہے جس میں پانی سے آدھا بھرا ہوا گلاس کئی آدمیوں کو دکھایا جاتا ہے اور ان کو یہ کہا جاتا ہے کہ یہ کیا ہے؟ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ پانی سے آدھا بھرا ہوا گلاس ہے جبکہ باقی لوگ کہتے ہیں کہ یہ آدھا خالی گلاس ہے۔دیکھا جائے تو دونوں اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں۔یہی بات یہاں بھی لاگو ہوتی ہے۔کشمیر کے مسئلے اور کشمیری

پنڈتوں کی ہجرت کو دیکھنے اور سمجھنے کے کئی نظریے ہیں۔کوئی ان کو جائز ٹھہرا سکتا ہے اور کوئی ناجائز۔مگر دیپک بدکی نے اس معاملے کو صرف ایک انسانیت پرست (Humanist) ادیب کی عینک سے دیکھا ہے۔وہ ان افسانوں میں انسانی درندگی، سفلہ پن اور بہیمیت کو اجاگر کرتے ہیں۔

ایک افسانہ نگار کے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت پر اس کی پیدائش، تعلیم اور ماحول کا بڑا اثر پڑتا ہے۔وہ سیاسی اثر ہو یا اقتصادی اثر ہو، وہ تہذیبی وثقافتی اثر ہو یا سائنسی وٹیکنالوجی کا اثر ہو، تاہم ہر فیلڈ کا اثر انسانی زندگی پر پڑتا ہے اور اس کا ردِعمل مخصوص ہوتا ہے۔افسانہ نگار بھی اپنی تخلیقات میں اسی مخصوص ردِعمل کو پیش کرتا ہے جسے افسانوں میں رنگا رنگی اور تنوع دیکھنے کو ملتا ہے۔دیپک بدکی کے افسانوں میں وہ ساری خوبیاں نظر آتی ہیں جو ایک اچھے افسانہ نویس میں ہونی چاہئیں۔ان کا ہر ایک افسانہ انوکھے پن کی بدولت اپنی ایک الگ پہچان بنانے میں کامیاب ہوتا ہے۔

دیپک بدکی کے افسانوں میں مقصدیت صاف طور پر جھلکتی ہے۔وہ اپنے افسانوں میں کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی درس دینا نہیں بھولتے ہیں۔اس افسانوی مجموعے میں بھی دیپک بدکی نے اپنے تجربے اور دور اندیشی کے پیش نظر بہت سی نصیحت آمیز باتوں کو باور کرایا ہے۔ملاحظہ کیجیے افسانے ٹک شاپ، موچی پپلا، احتجاج، سپنوں کا شہر، ورثے میں ملی سوغات، اماں وغیرہ۔ان سبھی افسانوں میں کسی ہم عصر مسئلے پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ایک طرح سے معاشرے میں رہنے والے لوگوں کے لیے پیغام چھپا رکھا ہے۔اس بارے میں سلطانہ مہر فرماتی ہیں:

> ''دیپک بدکی کی کہانیاں انسانی جذبات واحساسات کی منہ بولتی تصویریں ہیں اور کسی یونانی دانشور کے بقول بدکی بھی اپنی فکر کی اینٹوں کو جذبات کے گارے مٹی سے جوڑ کر ایک ایسی بستی کی تخلیق کرتے ہیں جہاں ان کے کردار خوشی اور غمی کے ماحول میں تجربے کی بھٹی میں تپ کر اس معاشرے کی تشکیل کرتے ہیں جو ہمارا آپ کا معاشرہ ہے۔اس معاشرے کی عمارت جذبات کی بنیاد پر قائم ہے۔ اگر انسان کے جذبات مردہ ہوجائیں تو اس کے دل سے تمام خواہشات اور امنگیں ختم ہوجائیں۔'' ۲۷

جیسا کہ پہلے بھی ذکر آچکا ہے بدکی کی زندگی اور ان کی فکر وسوچ پر ان کے پھوپھا آنجہانی شام لعل صراف کا کافی اثر رہا ہے۔صراف صاحب نے اپنی پوری زندگی کشمیر کو ڈوگرہ حکومت سے آزاد کرانے اور لوگوں کی خدمت کرنے میں گزارا۔وہ گاندھی جی کے فکر ونظر سے بے حد متاثر تھے اور ان کو اپنا گرو مانتے تھے۔پندرہ سال ریاستی کابینہ میں منسٹر رہنے اور پانچ سال لوک سبھا کا ممبر ہونے کے باوجود انھوں نے کبھی اپنے کردار پر کسی غلط سوچ وفکر کا سایہ نہیں پڑنے دیا۔یہی وجہ ہے کہ صراف صاحب بدکی کی زندگی میں ان کے ہیرو بنے رہے اور ان کے نقش قدم پر ساری عمر

چلتے رہے۔اس بات کی طرف بدکی نے اپنے دوسرے افسانوی مجموعے'چنار کے پنجے' کے انتساب میں اشارہ کیا ہے۔انتساب یوں ہے:

"گاندھی جی کے اصولوں پر چلنے والے اپنے پھوپھا آنجہانی شام لال صراف کے نام جنھوں نے میرے وجود کو عنوان دے دیا۔"۲۸

دراصل بدکی میں انسانی ہمدردی کے جذبات واحساسات کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہیں پھر چاہے ظلم کسی بھی طبقے، ذات یا مذہب سے تعلق رکھنے والے پر ہوا ہو۔ان کا دل اروناچل کے لیبر کیمپ کی جلکا کے لیے بھی اسی زور سے دھڑکتا ہے جس زور سے بکرافرقے سے تعلق رکھنے والی فاطمہ کے لیے یا پھر ان کو کشمیر کی ارن دتی سے اتنی ہی محبت ہے جتنی عراق کے علی سے۔انھوں نے اپنے افسانوں میں زیادہ تر متوسط طبقے کے کرداروں کو ہی شامل کیا ہے کیونکہ ان کی ملازمت (سول اور فوجی)، مرتبہ، اور شہری زندگی دوسرے لوگوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے میں ہمیشہ مانع رہی۔اس کی وضاحت وہ خود ہی اپنے ایک انٹرویو میں کرتے ہیں:

"فوج میں بھی نو سال گزارے۔وہاں تو آدمی بالکل ہی کٹ کر رہ جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ میری کہانیوں کے اکثر و بیشتر کردار متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں ۔"۲۹

کسی بھی فنکار کو مقبولیت اور شہرت تبھی ملتی ہے جب اس کے فن میں سچائی ہو، خلوص ہو اور بے باکی ہو۔لیکن اس کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ خود فنکار میں بھی اچھی خوبیاں ہوں اور وہ اس ہیرے کی مانند ہو جو پتھر میں چھپا رہتا ہے جب تک اس کو ڈھونڈنے والے ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ڈاکٹر انور ظہیر انصاری نے اپنے مضمون"دیپک بدکی کے افسانوں کا فکری وفنی جائزہ"میں بدکی کے کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

"دیپک بدکی کرنل بھی ہیں اور جنرل بھی، صحافی، ناقد، افسانہ نگار اور مبصر بھی اور اس سے بڑھ کر اچھے انسان بھی حالانکہ اچھا ادیب اچھا انسان ہو یہ بھی ضروری نہیں۔لیکن بدکی کے لیے یہ دونوں باتیں ایک ساتھ کہی جا سکتی ہیں یعنی یہ کہ وہ جتنے اچھے انسان ہیں اتنے ہی بہتر ایک افسانہ نگار بھی ہیں۔"۳۰

بدکی کو ان کے افسانوی مجموعوں کے منظر عام پر آنے سے ادبی حلقے میں ایک نئی پہچان ملی۔ان کا افسانے لکھنا آج بھی جاری ہے۔جب ادیب فکر وفن کے میدان میں ترقی کی منزلیں طے کرتا ہے، وہ دنیا کی نظروں میں عام سے خاص بن جاتا ہے۔اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا ہے کہ دیپک بدکی نے سوسائٹی میں اپنی محنت اور لگن سے ایسا مرتبہ حاصل کیا تھا (وہ سنٹرل گورنمنٹ میں اڈیشنل سیکریٹری کے عہدے سے سبکدوش ہوئے) کہ انہیں کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں تھی۔تاہم ان کے جنون نے انہیں ایک ایسے سفر کے لیے اکسایا جس میں کہیں آرام کی گنجائش نہیں تھی۔ان کو اپنے افسانوی مجموعوں کی بدولت ہی ایک دائمی پہچان ملی۔مختلف رسالوں میں گوشے

چھپنے کے بعد ان کے چرچے عام ہوئے اور اب تو ان کی قابلیت اور فنکاری کا سبھی ادب نواز لوگ اعتراف کرتے ہیں۔ ان کے پہلے افسانوی مجموعے 'ادھورے چہرے' کا پہلا ایڈیشن جو ۱۹۹۹ء میں شایع ہو چکا تھا، تقریباً ختم ہوا مگر اس مجموعے کا تقاضا سبھی دوست احباب کر رہے تھے۔ اس لیے بدکی نے اس مجموعے کا دوسرا پیپر بیک ایڈیشن اپنی لاگت سے ۲۰۰۵ء میں چھپوایا اور ان سب دوستوں کو ارسال کیا۔ دوسرا ایڈیشن اتنی جلدی شائع کرنے کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ پہلے ایڈیشن میں کمپوزنگ کی ۱۰۰ سے زائد غلطیاں رہ گئی تھیں جن کا تدارک دوسرے ایڈیشن میں کیا گیا۔ علاوہ ازیں دوسرے ایڈیشن میں کچھ وضاحتی فُٹ نوٹ بھی دیے گئے تاکہ افسانہ لکھنے کی تحریک وغیرہ کے بارے میں اشارہ کیا جائے۔ مثلاً بدکی 'جاگو' نامی افسانے کے فُٹ نوٹ میں یوں رقم طراز ہیں:

> ''جاگو کے بارے میں کئی نقادوں نے یہاں تک کہا کہ یہ سرے سے افسانہ ہے ہی نہیں۔ بات دراصل یوں ہے کہ یہ افسانہ ایمرجنسی کے دوران قلمبند کیا گیا۔ ان دنوں حاکم وقت معمولی تنقید بھی برداشت نہیں کرتے تھے۔ اس لیے مجھے تجریدی طرز تحریر سے کام لینا پڑا۔ اس کہانی کا راوی ایک پڑھا لکھا بے روزگار آدمی موسیٰ ہے جو ناسازگار حالات کی تاب نہ لا کر اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا ہے۔''[۳۱]

۲۰۰۵ء میں ہی دیپک بدکی کے پہلے افسانوی مجموعے 'ادھورے چہرے' کا ہندی ایڈیشن بھی نجی سرمائے سے منظر عام پر آیا۔ حالانکہ بدکی نے دسویں تک ہندی کو اختیاری مضمون کے طور پر پڑھا ہے پھر بھی وہ اپنے آپ کو اس لائق نہیں سمجھتے ہیں کہ ہندی میں لکھیں۔ البتہ اس کتاب کے ترجمے میں انہیں ایک رفیق کار، دلجیت کور، کی مدد ملی جس کے ساتھ بیٹھ کر کتاب کا ترجمہ کیا گیا۔ ترجمہ بالکل اوریجنل جیسا لگ رہا ہے۔ دلجیت کور کی مدد سے ہی انھوں نے دوسرے مجموعے، 'چنار کے پنجے' کا ترجمہ بھی کیا اور اس کتاب کو ۲۰۱۰ء میں چندر مُکھی پبلشرز دہلی نے شائع کیا۔

دیپک بدکی نے صرف افسانے ہی نہیں لکھے ہیں بلکہ دوسرے ادیبوں کی شعری اور نثری تخلیقات کا غور سے مطالعہ کر کے ان پر سیر حاصل تبصرے بھی لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے معروف افسانہ نگار، طنز نگار اور پریم چند پر تحقیق کرنے والے محقق، مانک ٹالا کی شخصیت اور فن پر کئی مضامین لکھے ہیں جو 'عصری تحریریں' میں شامل ہیں اور جن کے بارے میں قیصر تمکین نے رائے دی تھی کہ اگر اسے بطور ریسرچ مقالہ پیش کیا جائے تو ڈاکٹریٹ کی ڈگری مل سکتی ہے۔ بدکی نے اردو سے جڑے عام موضوعات اور شخصیتوں پر بھی تنقیدی مضامین لکھے ہیں۔ چنانچہ ۲۰۰۶ء میں ان کی تنقیدی مضامین اور تبصروں پر مبنی کتاب، 'عصری تحریریں' منصۂ شہود پر نمودار ہوئی۔ اس کتاب کے تعارفی نوٹ میں شبیر احمد، ناشر، میزان پبلشرز، سرینگر لکھتے ہیں:

''زیرنظر کتاب جناب دیپک بدکی کی ان تحریروں پر مشتمل ہے جوانھوں نے مختلف کتابوں اورتحریروں پر تبصرہ کرتے کرتے رقم کی ہیں۔'' ۳۲؎

دیپک بدکی کا تیسرا مجموعہ 'زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی' کے نام سے ۲۰۰۷ء میں منظر عام پر آیا۔اس افسانوی مجموعے کے زیادہ تر افسانے مختلف رسالوں میں چھپ چکے ہیں۔اس افسانوی مجموعے کے بارے میں خان احمد فاروق لکھتے ہیں:

''دیپک بدکی مختلف اردو رسائل میں مسلسل شائع ہونے کے سبب اردو افسانے میں ایک خاصہ جانا پہچانا نام ہے۔'زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی' مصنف کا تیسراافسانوی مجموعہ ہے۔'' ۳۳؎

دیپک بدکی نے اپنے افسانوں میں انسانی زندگی کے اصلی مقصد اوراس مقصد سے بھٹکنے کی روداد پیش کی ہے۔ چاہے وہ کسی کردار کے توسط سے ہو یا پھر افسانے کی تھیم کے ذریعے ہو۔غرض یہ کہ انھوں نے انسانی زندگی کے مختلف گوشوں کا بہت ہی قریب سے مشاہدہ کیا ہے۔انھوں نے انسانی کردار کے مثبت اور منفی پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ان کی خوبی یہ ہے کہ وہ بندے ٹکے اصولوں کو دائمی نہیں مانتے اور نہ ہی کسی مذہب پر یقین رکھتے ہیں۔بچپن ہی سے وہ برٹرینڈ رسل اور آچاریہ جدّو کرشنا مورتی کی طرح ناستک رہے ہیں۔اس کے باوجود انھوں نے گیتا، قرآن اور بائبل کا مطالعہ کیا ہے اور مختلف صحیفوں کی اچھی باتوں سے متاثر ہوئے ہیں۔سائنس کی تعلیم اور علم حیاتیات نے انہیں عقلیت پسند (Rationalist) بنایا ہے۔ان کا ماننا ہے کہ انسان اپنے کیے کا پھل اسی دنیا میں پاتا ہے وہ چاہے جسمانی طور پر ہو یا ذہنی طور پر۔جنت اور جہنم کا کس نے دیکھا ہے۔یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی ملازمت کے دوران ہمیشہ بے ایمانی، رشوت خوری، جانبداری اور اقربا پروری سے پرہیز کیا۔ دیپک بدکی ہمیشہ کھلا ذہن رکھنے والے ایک ایسے واحد شخص ہیں جنھوں نے اپنے افسانوں کے ذریعے دنیا میں تعمیر کے نام پر ہو رہی تخریب، بدلتے سیاسی وسماجی اقدار، اور لوگوں کے بدلتے نظریات وغیرہ کے بارے میں بے باکی اور کھلے پن سے لکھا ہے۔جنس کو وہ شجر ممنوعہ نہیں مانتے۔بقول ان کے زندگی خود کو جنسی افعال کے ذریعے ہی قائم ودائم رکھ پاتی ہے اور اگر جنس نہ ہوتا تو زندگی نہ ہوتی۔اس لیے وہ جنس کے بارے میں سوچنا یا لکھنا کوئی بری بات نہیں سمجھتے۔وہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ اگر مغربی لٹریچر میں کھلے طور پر جنس پر لکھا جاسکتا ہے تو مشرقی لٹریچر میں کیوں نہیں؟ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ مختلف کتابوں کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں جس کی بدولت ان کے افسانوں میں گہرے مطالعے کا اثر بخوبی دیکھنے کو ملتا ہے۔ان کی ادبی خدمات کے طور پر ان کے افسانوی مجموعے، تنقیدی مضامین اور تبصرے پیش کیے جاسکتے ہیں۔

۲۰۰۶ء میں ادبی رسالے 'انتساب' سرونج، مدھیہ پردیش اور ۲۰۰۷ء میں سہ ماہی 'اسباق' پونے نے دیپک بدکی کے گوشے شائع کیے جن کی بہت پذیرائی ہوئی۔ ان گوشوں سے ان کی مزید شہرت و مقبولیت ممکن ہوئی۔ اس کے علاوہ انھوں نے کئی سیمناروں میں وقتاً فوقتاً شرکت فرمائی اور اپنا مقالہ بھی پیش کیا۔

'' سہ روزہ آل انڈیا سیمنار 'برصغیر میں اردو زبان و ادب۔ کل آج اور کل' ۲۷۔۲۸ اگست ۲۰۰۷ء زیر اہتمام کشمیر یونیورسٹی ('جموں و کشمیر میں اردو افسانہ' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا)۔'' ۳۴

دو روزہ قومی سیمنار 'ریاست جموں و کشمیر میں اردو۔ ماضی، حال اور مستقبل' ۱۲۔۱۳ جنوری ۲۰۰۹ء زیر اہتمام سنٹر فار پروفیشنل اسٹڈیز ان اردو، جموں یونیورسٹی، شعبہ اردو، کشمیر یونیورسٹی اور قومی کونسل برائے فروغ اردو، دہلی ('ریاست جموں و کشمیر میں اردو کا مستقبل' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔

'زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی' کی رسم رونمائی جموں و کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز کے زیر اہتمام ہوئی تھی۔ بعد میں جموں و کشمیر اردو اکادمی کی طرف سے اسی تصنیف پر افسانہ نگار کو اعزاز بھی ملا۔ اس کے علاوہ ۹ جنوری ۲۰۰۸ کو آندھرا پردیش اردو اکادمی، اور بعد میں سد بھاونا منچ، سرونج، مدھیہ پردیش کی جانب سے دیپک بدکی کو ان کی ادبی خدمات کے لیے اعزازات دیے گئے۔ ۲۰۰۹ء میں انٹرنیشنل فرینڈ شپ سوسائٹی کی طرف سے موصوف کو ان کے آفیشل کام اور ادبی خدمات کے لیے راشٹریہ گورو ایوارڈ بھی عطا کیا گیا۔

۲۰۰۹ء میں دیپک بدکی کی تنقیدی تصنیف 'عصری شعور (تنقیدی مضامین اور تبصرے)' شائع ہوئی۔ اس کتاب میں بھی کئی عصری مسئلوں اور ادیبوں پر تفصیلی مضامین شامل ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سارے شعری اور نثری تصانیف پر تبصرے بھی شامل ہیں۔ دیپک بدکی جب کسی کتاب پر تبصرہ کرتے ہیں تو عنوان دیکھ کر تبصرہ نہیں کرتے بلکہ وہ کتاب کو اوّل تا آخر پڑھتے ہیں اور اس کی روح سمیٹ کر قرطاس پر اتارتے ہیں۔ جیسا کہ دیپک بدکی نے اشارہ کیا ہے انھوں نے اپنی دو تنقیدی تصانیف میں جو تنقیدی مضامین اور تبصرے لکھے ہیں وہ صرف ہم عصر قلم کاروں تک محدود ہیں اور ان میں اساتذہ کا کام شامل نہیں ہے۔ اس کی وجہ وہ یوں بیان کرتے ہیں کہ اردو کی زبوں حالی اور سکڑتی دنیا کو دیکھ کر یہ ضروری ہے کہ نئے قلم کاروں کا اردو دنیا میں تعارف کرایا جائے اور ان کی تخلیقات کی خوبیوں اور کوتاہیوں پر روشنی ڈالی جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ قارئین ان کتابوں کو پڑھنے کے لیے مائل ہوں۔ جہاں تک اساتذہ کا سوال ہے ان کے کلام پر تو آئے دن گورنمنٹ کے چندے سے کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ حال ہی میں دیپک بدکی کا ایک اور افسانوی مجموعہ 'ریزہ ریزہ حیات' (۲۰۱۱ء) منظر عام پر آ چکا ہے جس کا ایک افسانہ 'ڈاکٹر آنٹی' فیس بک پر بہت ہی مقبول ہو چکا ہے۔ اس مجموعے کے افسانوں میں بھی بیانیہ کا استعمال کیا گیا

ہے۔کئی کہانیاں بدکی کے ذاتی تجربات پرمبنی ہیں۔افسانہ ’ریزہ ریزہ حیات‘، جو کتاب کا ٹائٹل بھی ہے، کشمیر کی دہشت گردی پرلکھی گئی ایک دل گداز کہانی ہے۔

دیپک بدکی نے بہت ہی کم وقت میں اپنی الگ پہچان بنالی ہے جبکہ اردوادب میں بہت سے ایسے ادیب و فنکار موجود ہیں جواس طرح کی پہچان سے آج بھی محروم ہیں۔ان سب کے پیچھے ایک ٹھوس وجہ یہ ہے کہ بدکی نے اپنی قابلیت، لگن،محنت اورایمانداری کی بدولت اپنی پہچان خود بنائی ہے۔بدکی کی کئی کہانیوں کے ترجمے بعض دوسری زبانوں میں ہوچکے ہیں۔اردواور ہندی کے علاوہ یہ ترجمے کشمیری، انگریزی،مراٹھی اورتیلگو میں کیے گئے ہیں۔ آج بھی مختلف رسالوں میں ان کے افسانے شائع ہورہے ہے۔مثال کے طور پر رسالہ ’ایوان اردو‘ (جلدنمبر۲۴، شمارہ نمبر۶) کے اکتوبر۲۰۱۰ء کے شمارے میں ان کا بہترین افسانہ’’ دس انچ زمین‘ کے عنوان سے افسانہ شائع ہوا ہے۔ایسے بہت سے افسانوں کوانھوں نے حال ہی میں اپنے چوتھے افسانوی مجموعہ ’ریزہ ریزہ حیات‘ میں شامل کرلیاہیں۔اس مجموعہ میں موجودہ دور کی انسانی زندگی کا خوبصورت عکس کھینچا گیاہے۔

مجموعی طور پر مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ دیپک بدکی موجودہ دور کی آزاداور بے باک آواز ہے۔وہ انسانی فطرت کوقریب سے جانتے ہیں اورافسانے کواپنے فکروسوچ کی ترسیل کا ذریعہ بناتے ہیں۔وہ انسان کی سفلی خصلت سے قارئین کوآ گاہ کرتے ہیں مگر رجائیت کا دامن نہیں چھوڑتے ہیں۔

☆☆

باب: دوم دیپک بدکی ۔حیات کے اہم سنگ میل

حوالہ جات

صفحہ	مصنف / مدیر	مضمون / تصنیف	نمبر
۲۰۰	سید شریف الحسن نقوی، مخمور سعیدی	بحوالہ ماہنامہ ایوان اردو دہلی، دسمبر ۱۹۸۹ء نہرو نمبر	(۱)
۹	آسیہ سیفی	بحوالہ سہ ماہی انتساب، سرونج ۲۰۰۷ء (گوشہ دیپک بدکی)	(۲)
۲۵	۱) پروفیسر شہاب عنایت ملک ۲) ڈاکٹر فرید پربتی ۳) ڈاکٹر انور ظہیر انصاری	بحوالہ ورق ورق آئینہ: دیپک بدکی شخصیت اور فن، مرتبین	(۳)
۲۲۹	سید شریف الحسن نقوی، مخمور سعیدی	بحوالہ ایوان اردو دہلی، دسمبر ۱۹۸۹ء نہرو نمبر	(۴)
۶۹	شری دِنیش بھائی شُکل اور دیگر اراکین	سماجی سائنس جماعت ۔۹	(۵)
۱۸	۱) پروفیسر شہاب عنایت ملک ۲) ڈاکٹر فرید پربتی ۳) ڈاکٹر انور ظہیر انصاری	بحوالہ ورق ورق آئینہ: دیپک بدکی شخصیت اور فن، مرتبین	(۶)
انتساب	دیپک بدکی	عصری تحریریں	(۷)
۱۸	۱) پروفیسر شہاب عنایت ملک ۲) ڈاکٹر فرید پربتی ۳) ڈاکٹر انور ظہیر انصاری	بحوالہ ورق ورق آئینہ: دیپک بدکی شخصیت اور فن، مرتبین	(۸)
۳۴	آسیہ سیفی	بحوالہ سہ ماہی انتساب، سرونج ۲۰۰۷ء (گوشہ دیپک بدکی)	(۹)
۱۹	۱) پروفیسر شہاب عنایت ملک ۲) ڈاکٹر فرید پربتی ۳) ڈاکٹر انور ظہیر انصاری	بحوالہ ورق ورق آئینہ: دیپک بدکی شخصیت اور فن، مرتبین	(۱۰)

(۱۱) ایضاً	” ”	۲۳
(۱۲) ایضاً	” ”	۲۴
(۱۳) ایضاً	” ”	۲۳
(۱۴) ایضاً	” ”	۲۰
(۱۵) ایضاً	” ”	۱۶
(۱۶) ایضاً	” ”	۴۴
(۱۷) ایضاً	” ”	۳۳
(۱۸) ایضاً	” ”	۳۷
(۱۹) ایضاً	” ”	۲۱
(۲۰) بحوالہ سہ ماہی انتساب، سرونج ۲۰۰۷ء (گوشہ دیپک بدکی)	آسیہ سیفی	۱۸
(۲۱) بحوالہ ورق ورق آئینہ: دیپک بدکی شخصیت اور فن، مرتبین	۱) پروفیسر شہاب عنایت ملک ۲) ڈاکٹر فرید پربتی ۳) ڈاکٹر انور ظہیر انصاری	۱۱۳_۱۱۴
(۲۲) ایضاً	” ”	۹۱
(۲۳) ایضاً	” ”	۲۶
(۲۴) ایضاً	” ”	۱۵
(۲۵) ایضاً	” ”	۲۲
(۲۶) ایضاً	” ”	۲۴۳
(۲۷) ایضاً	” ”	۵۴
(۲۸) چنار کے پنجے۔افسانوی مجموعہ	دیپک بدکی	۵
(۲۹) ایضاً	” ”	۴۴
(۳۰) ایضاً	” ”	۵۶
(۳۱) ادھورے چہرے۔افسانوی مجموعہ	دیپک بدکی	۳

(۳۲) عصری تحریریں　　　　دیپک بدکی　　　　عرض ناشر

(۳۳) بحوالہ ورق ورق آئینہ: دیپک بدکی شخصیت اور فن، مرتبین ۱) پروفیسر شہاب عنایت ملک　۲۵۴
۲) ڈاکٹر فرید پربتی
۳) ڈاکٹر انور ظہیر انصاری

(۳۴) ایضاً　　　　”　　　　”　　　　۱۵

☆☆☆